www.cpsglobal.org

الرسالہ
Al-Risala

December 2001 ● No. 301

الرسالہ، دسمبر، 2001

فہرست

روزہ کی عظمت	4
امن اور اسلام	6
سوال و جواب	22
خطوط	35

روزہ کی عظمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کے بارے میں فرمایا: **كل عمل ابن آدم يضاعف الحسنة بعشر أمثالها الى سبعمأة ضعف، قال الله تعالىٰ: إلا الصوم فإنه لى وأنا أجزى به، يدع شهوته و طعامه من أجلى، للصائم فرحتان: فرحة عند فطره، و فرحة عند لقاء ربه، و لخلوف فم الصائم أطيب عند الله من ريح المسك والصيام جنة، و إذا كان يوم صوم احدكم فلا يرفث و لايصخب، فإن سابّه احد او قاتله فليقل: إنى امرؤ صائم۔**

انسان کے ہر عمل کی نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مگر روزہ، پس وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ دار میرے لئے اپنی شہوت کو اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی اس کے افطار کے وقت، اور ایک خوشی اپنے رب سے ملاقات کے وقت۔ اور روزہ دار کے منھ سے نکلنے والی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ اور روزہ ڈھال ہے۔ جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہو تو وہ نہ بدگوئی کرے اور نہ جھگڑا کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو وہ کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔

یہ روایت صحیحین میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں آئی ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ ہے کہ روزہ اللہ کے لئے ہے، اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا جواب قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں روزہ کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور کھلی نشانیاں راستہ کی اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا۔ پس تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے وہ اس کے روزے رکھے (البقرہ ۱۸۵)۔ اس کے مطابق، نزول قرآن کے مہینہ میں روزہ رکھنے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ لوگ خصوصی تربیت کے

ذریعہ اپنے آپ کو تیار کریں کہ وہ قرآن کے حامل اور مبلغ بن سکیں۔

قرآن کو تمام لوگوں تک پہنچانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے ایسے انسان درکار ہیں جو اپنی ذات کے لئے جینے والے نہ ہوں بلکہ وہ تمام تر اللہ کے لیے جینے والے ہوں۔ جن میں یہ حوصلہ ہو کہ وہ ایک ربانی مشن کے لئے اپنی خواہشات پر روک لگا دیں۔ جو پر رونق زندگی کے بجائے خشک زندگی پر راضی ہو جائیں۔ جن کے اندر یہ برداشت ہو کہ وہ لوگوں کی منفی باتوں کا بھی مثبت جواب دے سکیں۔ جو شعوری اعتبار سے اتنا بلند ہوں کہ لوگوں کی مخالفتیں ان کو قرآنی مشن سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

قرآن کے پیغام ہدایت کو اللہ کے تمام بندوں تک پہنچانا خالص اللہ کا کام ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی دنیوی فائدہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس کو صرف اپنا کام قرار دیا اور اس پر خصوصی انعام کا اعلان فرمایا۔

جو لوگ قرآن کا علم حاصل کریں، وہ اپنے اندر داعیانہ کردار پیدا کریں، وہ قرآن کے پیغام کو لوگوں کے لیے قابلِ قبول بنانے میں اپنی ساری کوشش صرف کر ڈالیں، جو یک طرفہ طور پر اس ذمہ داری کو قبول کریں کہ انہیں ہر قسم کی ناخوش گواریوں کو برداشت کرنا ہے تا کہ اللہ کا پیغام لوگوں کے لیے قابل قبول ہو سکے۔ حتیٰ کہ اس مقصد کے لیے وہ بھوک اور پیاس کی مشقت برداشت کرنے کے لیے راضی ہو جائیں ـــــــ ایسے لوگ اللہ کے خاص بندے ہیں، وہ اس کے مستحق ہیں کہ اللہ اُن پر اپنی خصوصی نوازشوں کی بارش کرے۔

روزہ دار کا اللہ کے لیے اپنی خواہشوں کو چھوڑنا یہ ہے کہ وہ ذاتی کامیابی کے بجائے اللہ کے دعوتی مشن کو اپنا مقصد بنائے۔ وہ خدا کی کتاب کے نزول کے مہنیہ میں خصوصی تربیتی کورس کے ذریعہ اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرے کہ وہ خدا کے پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچائے گا۔ وہ قرآن کی دعوت وتبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن بنائے گا، نہ کہ ذاتی مفاد کے حصول کو۔ اس کی زندگی کا مرکز ومحور قرآن ہوگا اور صرف قرآن۔

امن اور اسلام

Islam: the religion of peace

امریکن یونیورسٹی (واشنگٹن) میں ایک سہ روزہ سمپوزیم فروری ۱۹۹۸ء میں ہوا۔ اس کے اجلاس ۶ فروری میں راقم الحروف نے اسلام اور امن پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا ایک حصہ یہ تھا:

> It is no exaggeration to say that Islam and violence are contradictory to each other. The concept of Islamic violence is so obviously unfounded that prima facie it stands rejected. The fact that violence is not sustainable in the present world is enough to believe that violence as a principle is quite alien to the scheme of things in Islam. Islam claims to be an eternal religion and an eternal religion cannot afford a principle in its scheme which was not sustainable in the latter periods of human history. Any attempt to bracket violence with Islam amounts to making the very eternity of Islamic religion doubtful. (Al-Risala, August 1998, p. 9)

اسلامک ٹیررزم اسی طرح ایک متضاد اصطلاح ہے جس طرح پُر امن دہشت گردی (pacifistic terrorism)۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تمام تعلیمات امن کے اصول پر مبنی ہیں، خواہ براہ راست طور پر یا بالواسطہ طور پر۔

قرآن وحدیث میں امن کی تعلیم

خود لفظ اسلام میں امن کا مفہوم شامل ہے۔ اسلام کا روٹ ورڈ سِلم ہے۔ سِلم کے معنی امن کے ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلام کا مطلب ہے، امن کا مذہب۔ حدیث میں آیا ہے کہ: **السلام من الاسلام** (البخاری، کتاب الایمان) یعنی سلامتی اسلام کا جزء ہے۔ اسی طرح حدیث میں ہے: **المسلم من سلم الناس من لسانه و يده** (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے لوگ امن میں رہیں)۔

قرآن میں اللہ کے جو نام (صفت) بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک السلام (الحشر ۲۳) ہے۔ یعنی امن وسلامتی۔ گویا اللہ کی ذات خود صفت امن کا مظہر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: إن الله هو السلام (البخاری، کتاب الاذان) یعنی اللہ خود سلامتی ہے۔ اسی طرح اللہ کی ہدایت کو قرآن میں سبل السلام (المائدہ ۱۶) کہا گیا ہے۔ یعنی امن کے راستے۔ اسلام کے مطابق، جنت انسان کے قیام کی معیاری جگہ ہے، اور قرآن میں جنت کو دار السلام (یونس ۲۵) کہا گیا ہے۔ یعنی امن کا گھر۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جنت کا قول ایک دوسرے کے لئے سلامتی سلامتی (الواقعہ ۲۶) ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اہل جنت کا اجتماعی کلچر پیس کلچر ہوگا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: والصلح خير (النساء ۱۲۸)۔ یعنی صلح کی روش اپنے نتیجہ کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق، اللہ نے مصالحانہ طریقِ عمل پر وہ کامیابی مقدر کردی ہے جو اس نے غیر مصالحانہ یا متشددانہ طریقِ عمل پر مقدر نہیں کی۔

پیغمبر اسلام کی اہلیہ عائشہ بنت ابی بکر اجتماعی معاملات میں آپ کی جنرل پالیسی کو اس طرح بیان کرتی ہیں: ما خير رسول الله صلى الله عليه وسلم بين امرين الا اختار ايسرهما (البخاری، کتاب المناقب) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کا انتخاب کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب پُرامن عمل (peaceful activism) دستیاب ہو تو پُرتشدد ایکٹوزم (violent activism) کو اختیار نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ پُرامن عمل کی حیثیت مقابلۃً آسان انتخاب (easier option) کی ہے اور پُرتشدد عمل کی حیثیت مقابلۃً مشکل انتخاب (harder option) کی۔

مثلاً کسی تحریک کے پہلے ہی مرحلہ میں اسٹیٹس کو کو بدلنے کی کوشش کرنا مشکل انتخاب ہے اور اسٹیٹس کو کو بدلے بغیر حاصل شدہ دائرہ میں اپنا عمل جاری کرنا آسان انتخاب۔ نزاع کے موقع پر لڑ جانا مشکل انتخاب ہے اور نزاع کے موقع پر صلح کر لینا آسان انتخاب۔ حریف کے مقابلہ میں متشددانہ طریقِ کار کو اپنانا مشکل انتخاب ہے اور حریف کے مقابلہ میں پرامن طریقِ کار کو اپنانا آسان انتخاب۔ جارحیت

کا جواب جارحیت سے دینا مشکل انتخاب ہے اور جارحیت کا جواب صبر وتحمل سے دینا آسان انتخاب۔ مسئلہ پیدا ہونے کی صورت میں ہنگامہ آرائی کا انداز اختیار کرنا مشکل انتخاب ہے اور مسئلہ پیدا ہونے کی صورت میں خاموش تدبیر اختیار کرنا آسان انتخاب۔ اصلاح کے لئے ریڈیکل طریقہ اختیار کرنا مشکل انتخاب ہے اور اصلاح کے لئے تدریجی طریقہ اختیار کرنا آسان انتخاب۔ نتیجہ کی پروا کئے بغیر پرجوش اقدام کرنا مشکل انتخاب ہے اور نتیجہ کو سامنے رکھتے ہوئے حکیمانہ اقدام کرنا آسان انتخاب۔ حکمرانوں سے محاذ آرائی کرنا مشکل انتخاب ہے اور حکمرانوں سے اعراض کرتے ہوئے تعلیم وتربیت کے دائرہ میں اپنے عمل کا آغاز کرنا آسان انتخاب۔ ان چند مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث کے مطابق، اختیار ایسر کیا ہے اور اختیار اعسر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں امن کی حیثیت عموم (rule) کی ہے اور جنگ کی حیثیت صرف استثناء(exception) کی۔ اسلام کی تمام تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی عملی زندگی اس کی تصدیق کرتی ہے۔

پیغمبر اسلام کا نمونہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر ٦١٠ء میں مکہ میں پہلی وحی اتری۔ اللہ نے آپ کو جس مشن پر مامور کیا وہ توحید کا مشن تھا۔ اس مشن کی نسبت سے مکہ میں ایک بہت بڑا عملی مسئلہ موجود تھا۔ وہ یہ کہ کعبہ جس کو اللہ کے پیغمبر ابراہیم اور اسماعیل نے توحید کے گھر کی حیثیت سے بنایا تھا اس کو بعد کے زمانہ میں عملاً شرک کا مرکز بنا دیا گیا۔ وہاں ٣٦٠ بت رکھ دئے گئے۔

اس صورت حال کا بظاہر یہ تقاضا تھا کہ قرآن میں پہلا حکم اس مفہوم کا اترے کہ: **طَهِّر الكعبة من الأصنام** (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو)۔ مگر اس مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس وقت قرآن میں پہلا حکم یہ اترا کہ **وثيابك فطهر** (المدثر ٤) یعنی اپنے اخلاق اور سیرت کی تطہیر کرو۔ اگر پہلے ہی مرحلہ میں پیغمبر اسلام کو کعبہ کی تطہیر کا حکم دیا جاتا تو اس وقت جب کہ مکہ پر مشرکین کا غلبہ تھا، یقینی طور پر یہ حکم فوراً ٹکراؤ اور جنگ کا سبب بن جاتا۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق، پیغمبر اسلام مکی دور کے تیرہ سال تک کعبہ میں پُر امن طور پر نماز پڑھتے رہے جب کہ وہاں سیکڑوں کی تعداد میں بُت رکھے ہوئے

تھے۔اسی طرح آپ نے اور آپ کے اصحاب نے عمرۃ الحدیبیہ (۶۲۹ء) کے موقع پر کعبہ کا طواف کیا، جب کہ اس وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت بدستور موجود تھے۔

پیغمبر اسلام نے ایسا اس لئے کیا تا کہ مشرکین سے جنگ اور ٹکراؤ کو ایوائڈ کیا جا سکے اور امن کی حالت برقرار رہے۔آپ کی پوری زندگی اسی امن پسندانہ پالیسی کی مثال ہے —— مکہ سے ہجرت کے موقع پر مشرکین جنگ پر آمادہ تھے مگر آپ خاموشی کے ساتھ مکہ سے نکل کر مدینہ چلے گئے۔حدیبیہ ٹریٹی (۶۲۸ء) کے موقع پر پورے معنوں میں جنگی حالات پیدا ہو گئے تھے۔مگر آپ نے مشرکین کی یکطرفہ شرطوں پر راضی ہو کر ان سے امن کا معاہدہ کر لیا۔غزوۂ خندق (۶۲۷ء) کے موقع پر مشرکین کی بارہ ہزار فوج مدینہ کی سرحد پر جنگ کا چیلنج کر رہی تھی۔مگر آپ نے لمبی خندق کھود کر اپنے اور دشمنوں کے درمیان ایک فاصل (buffer) قائم کر دیا، وغیرہ۔

اسلام توحید کا مشن ہے۔اسلام کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو ایک اللہ کا پرستار بنایا جائے۔ لوگوں کے دل و دماغ کو اس طرح بدلا جائے کہ وہ صرف ایک اللہ سے محبت کریں (البقرہ ۱۶۵) اور صرف ایک اللہ سے خوف کریں (التوبہ ۱۸)۔صرف ایک اللہ ان کا سب سے بڑا کنسرن (concern) بن جائے۔

اس قسم کا دعوتی مشن جنگ اور متشددانہ ٹکراؤ کا تحمل نہیں کر سکتا۔اس لئے کہ جنگ اور تشدد کے حالات پیدا ہونے کے بعد وہ معتدل فضا ختم ہو جاتی ہے جب کہ ذہنی اصلاح اور روحانی انقلاب کی کوئی تحریک مؤثر طور پر چلائی جا سکے۔حقیقت یہ ہے کہ پر امن حالات ہمیشہ اسلام کے لئے موافق فضا بناتے ہیں اور پُر تشدد حالات ہمیشہ اسلام کے لئے مخالف فضا وجود میں لاتے ہیں۔

جنگ ایک ریاستی عمل

اسلام میں جنگ عوام کا کام نہیں ہے بلکہ وہ باضابطہ طور پر قائم شدہ حکومت کا کام ہے۔یعنی جس طرح عوام وقت آنے پر بطور خود نماز پڑھ لیتے ہیں اسی طرح وہ بطور خود جنگ یا قتال نہیں کر سکتے۔ جنگ یا قتال کا اعلان صرف ایک قائم شدہ ریاست کر سکتی ہے۔حکومت اگر پکارے تو عوام اس کے معاون بن کر اس کے تحت شریک ہو سکتے ہیں مگر خود سے وہ ہرگز کوئی جنگ نہیں چھیڑ سکتے۔

قرآن میں ایک عمومی حکم کے طور پر یہ اصول بتایا گیا ہے کہ جب بھی کوئی خوف (یا خارجی حملہ) کی صورت پیدا ہو تو عوام کو خود سے کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہئے۔ ان کو صرف یہ کرنا چاہئے کہ وہ اس معاملہ کو اولوالأمر (النساء ۸۳) یعنی حکام تک پہونچائیں اور انہیں موقع دیں کہ وہ حسبِ ضرورت اپنی جوابی کارروائی کا منصوبہ بنائیں۔

یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: **انما الإمام جنة، یقاتل من وراء ہ ویتقی بہ** (البخاری، کتاب الجہاد) یعنی حکمراں ڈھال ہے، قتال اس کی ماتحتی میں کیا جاتا ہے اور اسی کے ذریعہ بچاؤ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قتال کا اعلان یا اس کی منصوبہ بندی مکمل طور پر قائم شدہ حکومت کا کام ہے۔ عامۃ المسلمین اس کی ماتحتی میں رہ کر اور اس کے زیر حکم حسب ضرورت اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں، اس سے آزاد ہو کر نہیں۔

اس اسلامی اصول سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اس غیر حکومتی جنگ کی کوئی گنجائش نہیں جس کو عام طور پر گوریلا وار (Gorilla War) کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ گوریلا وار عوام کی آزاد تنظیموں کی طرف سے لڑی جاتی ہے، نہ کہ حکومتی ادارہ کی طرف سے۔ خود حکومتی ادارہ کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ کسی ملک یا قوم کے خلاف دفاعی جنگ لڑنا چاہتی ہے تو قرآن کے مطابق، پہلے وہ اس کا باضابطہ اعلان کرے۔ اور اگر اس کے خلاف کوئی معاہدہ ہے تو اس معاہدہ کو وہ منسوخ کردے (الانفال ۵۸) اسلام میں اعلان کے ساتھ جنگ ہے، بلا اعلان جنگ (undeclared war) اسلام میں نہیں۔ اس اصول کے مطابق، پراکسی وار (proxy war) اسلام میں جائز نہیں۔

اسلام کے تمام اعمال کی کچھ شرائط ہیں۔ اسی طرح اسلام میں جنگ کے لئے بھی کچھ لازمی شرائط ہیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جنگ خواہ کوئی باقاعدہ مسلم حکومت کرے، اور خواہ وہ دفاعی ہو، تب بھی اس جنگ کا نشانہ جارح لوگوں تک محدود ہوگا۔ یعنی اس جنگ میں مسلمانوں کی فوج صرف مقاتلین (combatants) پر وار کر سکتی ہے، غیر مقاتلین (non combatants) کو اپنے حملہ کا نشانہ بنانا پھر بھی جائز نہ ہوگا۔

چنانچہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ جنگ نہ کرو جنہوں نے تم سے جنگ نہیں کی۔ ایسے لوگوں کے ساتھ تم حسن سلوک اور انصاف کا معاملہ کرو۔ البتہ جن لوگوں نے تم سے جنگ کی ان سے جنگ کرنے کے لئے تم آزاد ہو۔ ان کے ساتھ تمہارا معاملہ دوستی کا معاملہ نہیں (الممتحنہ ۸۔۹)

اگر بالفرض کسی قوم کے ساتھ مسلم حکومت کی جنگ چھڑ جائے اور یہ جنگ اسلامی شرائط کے مطابق ہو تب بھی مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ عام شہریوں کے خلاف اس قسم کی تخریبی کارروائی کریں جیسی تخریبی کارروائی مثال کے طور پر، ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک اور واشنگٹن میں کی گئی۔

اسی طرح جائز اسلامی جنگ میں بھی مسلمانوں کو اجازت نہیں کہ وہ فریقِ ثانی پر خودکش بمباری کریں۔ یعنی بالقصد اپنے جسم پر بم باندھ کر فریقِ ثانی کی فوجی یا شہری آبادی پر ٹوٹ پڑیں اور جان بوجھ کر اپنے کو ہلاک کر کے فریقِ ثانی کو ہلاک کریں۔ اس قسم کا معاملہ ہرگز شہادت یا استشہاد نہیں۔ اسلام میں شہید ہونا ہے، اسلام میں شہید کروانا نہیں ہے۔

دشمن اور جارح کا فرق

اللہ نے اپنی حکمتِ امتحان کے تحت دنیا میں انسان کو آزادی دی ہے۔ اس آزادی کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان دشمنیاں قائم ہوتی ہیں (طٰہٰ ۱۲۳)۔ حتیٰ کہ لوگوں کے درمیان جنگ کی نوبت آجاتی ہے۔ مگر اسلام میں دشمنی اور جنگ دونوں میں واضح فرق کیا گیا ہے۔

اہل اسلام کو یہ حق نہیں کہ وہ جس کو اپنا دشمن سمجھیں اس کے خلاف وہ جنگ چھیڑ دیں۔ دشمن کے مقابلہ میں اہلِ اسلام کو صرف پُر امن دعوت کا کام کرنا ہے، نہ کہ ان سے جنگ چھیڑ دینا۔ اس سلسلہ میں قرآن میں واضح حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا (حٰمٓ السجدہ ۳۳، ۳۴)۔ گویا اسلام میں دشمن کو پُر امن کوشش کے

ذریعہ اپنا دوست بنانا ہے، نہ کہ اس کو دشمن قرار دے کر اس کے خلاف جنگ کرنا۔

اسلام میں جنگ کی اجازت ہے مگر یہ اجازت صرف ان حالات میں ہے جب کہ اعراض کے باوجود فریقِ ثانی حملہ کر دے اور حقیقی دفاع کی صورت پیدا ہو جائے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **اُذِن للذین یقاتَلون بأنھم ظلموا** (الحج ۳۸) یعنی ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جاتی ہے اس سبب سے کہ ان پر ظلم ہوا۔ قرآن میں دوسری جگہ جنگ کی اجازت دیتے ہوئے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ یہ فریقِ ثانی ہے جس نے کہ پہلی بار جنگ کی ابتداء کی (التوبہ ۱۳)۔

معلوم ہوا کہ اسلامی تعلیم کے مطابق، جنگ دشمن کے خلاف نہیں بلکہ حملہ آور کے خلاف ہے۔ مسلمان اگر کسی کو اپنا دشمن سمجھیں تو ان کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اس کے خلاف حملہ کر دیں۔ ایسے لوگوں کے مقابلہ میں اوّل و آخر جو حق دیا گیا ہے وہ پُر امن دعوت ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ متشددانہ جارحیت کے خلاف دفاعی جنگ اسلام میں جائز ہے، مگر وہ بھی اس وقت جب کہ جنگ سے اعراض کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی ہوں۔ پیغمبر اسلام کا عملی نمونہ اس کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

جنگ ایک غیر مطلوب شئے

اسلام کے لئے جنگ کا ماحول اتنا ہی غیر مطلوب ہے جتنا کہ تجارت کے لئے نفرت وتشدد کا ماحول غیر مطلوب ہے۔ تجارت امن اور اعتدال کے ماحول میں کامیاب ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام کے مقاصد صرف امن کے حالات اور نارمل تعلقات میں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ: **أیّھا الناس لا تتمنوا لقاء العدو، و سلوا اللہ العافیۃ** (البخاری، کتاب الجہاد) یعنی اے لوگو، تم دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، بلکہ تم اللہ سے امن مانگو۔

جنگ کرنے والے ہمیشہ سیاسی اقتدار کیح صول کے لئے جنگ کرتے ہیں اور سیاسی اقتدار اسلام میں کوئی ایسی چیز ہی نہیں جس کے حصول کے لئے جنگ کی جائے۔ قرآن کے مطابق، سیاسی اقتدار اہلِ اسلام کا نشانہ نہیں بلکہ وہ ایک امرِ موعود (النور ۵۵) ہے۔ قرآن کے مطابق، اقتدار کا مالک اللہ ہے، وہی جس کو چاہتا ہے اسے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اس سے اس کو چھین لیتا ہے

(آل عمران ۲۶) یہی وجہ ہے کہ اقتدار اور سیاسی فتح کبھی ایک کے حصہ میں آتی ہے اور کبھی دوسرے کے حصہ میں (آل عمران ۱۴۰)۔

اس قرآنی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ سیاسی اقتدار کا ملنا یا سیاسی اقتدار کا چھینا جانا دونوں فطرت کے قانون کے تحت پیش آتے ہیں، اقتدار نہ کسی گروہ کو اس کی کوشش سے ملتا ہے اور نہ کسی دوسرے گروہ کی سازش اس کو کسی سے چھین سکتی ہے۔

جنگ کے بغیر فتح

پیغمبر اسلام کی زندگی میں ایک واقعہ وہ ہے جس کو صلح حدیبیہ (۶۲۸ء) کہا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام اس وقت مدینہ میں تھے اور مکہ اہل شرک کے قبضہ میں تھا جو اس وقت آپ سے برسرِ جنگ تھے۔ پیغمبر اسلام نے عمرہ کی عبادت کے لئے مکہ جانا چاہا کیوں کہ کعبہ مکہ میں ہے، اس بنا پر عمرہ کی عبادت مکہ ہی میں ادا کی جاتی ہے۔ آپ کا یہ سفر خالص عبادتی سفر تھا۔ مگر مکہ والوں نے اس کو اپنے لئے عزت (prestige) کا سوال بنالیا۔ انہوں نے آپ کو مکہ سے باہر حدیبیہ کے مقام پر روک دیا اور کہا کہ آپ یہاں سے واپس جائیں۔ یہ بحث یہاں تک بڑھی کہ جنگ کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ اس وقت پیغمبر اسلام کے ساتھ چودہ سو مسلمان تھے۔ اگر یہ لوگ اس پر اصرار کرتے کہ وہ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں گے تو یقینی طور پر دونوں فریقوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی۔ مگر پیغمبر اسلام نے مشرکین کے مطالبہ کو مان لیا اور دس سال کا امن معاہدہ کر کے حدیبیہ سے مدینہ واپس آگئے۔

معاہدۂ حدیبیہ بظاہر مقابلہ کے میدان سے واپسی کا معاہدہ تھا۔ مگر جب یہ معاہدہ ہوگیا تو قرآن میں اس کو اہل اسلام کے حق میں فتح مبین (الفتح ۱) قرار دیا گیا۔ اُس وقت کے حالات میں اس کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگوں نے اپنے حریف سے جنگ نہ کر کے ان کے اوپر فتح حاصل کر لی۔

اس کا مطلب کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگ سے اعراض کر کے اور امن کا معاہدہ کر کے اہل اسلام کو یہ موقع (opportunity) حاصل ہوگیا کہ وہ اپنی طاقتوں کو جنگ میں ضائع ہونے سے بچائیں اور اس کو مکمل طور پر تعمیر اور استحکام میں لگائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تاریخ بتاتی

ہے کہ حدیبیہ کے معاہدۂ امن کے بعد دو سال کے اندر اہل اسلام نے اپنے آپ کو اتنا مستحکم بنالیا کہ وہ اس حیثیت میں ہو گئے کہ کسی با قاعدہ لڑائی کے بغیر صرف پُر امن تدبیر کے ذریعہ مکہ پر فتح حاصل کر لیں۔ ''جنگ کے بغیر فتح'' کا یہ اصول بلاشبہہ اسلام کا ایک نہایت اہم اصول ہے۔ یہ اصول فطرت کے اٹل نظام پر قائم ہے۔ وہ افراد اور گروہوں کے لئے بھی اتنا ہی مفید ہے جتنا کہ حکومتوں کے لئے۔ اس اصول کو ایک جملہ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے ــــــ ٹکراؤ سے اعراض کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔

Avoid the confrontation, and avail the opportunities.

قتال برائے ختم قتال

قرآن میں رسول اور اصحاب رسول کو جو احکام دیے گئے، ان میں سے ایک حکم یہ تھا:

وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة و يكون الدين كله لله فإن انتهوا فإنّ الله بما تعملون بصير (الأنفال ۳۹) یعنی اور ان سے سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ دیکھتا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔

اس آیت کے دو حصے ہیں۔ یہاں ایک ہی بات کو پہلے منفی اور اس کے بعد مثبت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فتنہ کی حالت کو اس طرح ختم کر دو کہ پوری طرح غیر فتنہ کی حالت قائم ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ انسان کی پیدا کردہ مصنوعی حالت نہ رہے بلکہ خدا کی مقرر کی ہوئی فطری حالت واپس آ جائے۔

اس آیت میں فتنہ سے مراد مذہبی جبر ہے جو قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں رائج تھا۔ قدیم زمانہ میں ہر جگہ بادشاہت کا رواج تھا۔ اس زمانہ میں زندگی کے صرف دو بڑے شعبے تھے ــــــ اقتدار اور زمین۔ یہ دونوں شعبے مکمل طور پر بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ اس طرح پوری انسانی زندگی عملاً بادشاہ کے قبضہ میں رہتی تھی۔ حتی کہ لوگوں کا مذہب بھی وہی ہوتا تھا جو بادشاہ کا مذہب ہوتا تھا۔ اس زمانہ کی حالت کو ایک قدیم عربی مقولہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: **الناس على دين ملوكهم**

(لوگ اپنے بادشاہوں کے مذہب پر ہوتے ہیں)۔

قدیم زمانہ میں جبر کی یہ صورتِ حال خدا کی فطری اسکیم کے خلاف تھی۔ اس کے نتیجہ میں ساری دنیا میں ایک قسم کی سیاسی مرکزیت (political centralization) قائم ہوگئی تھی۔ اس نظام کے اندر ہر کام صرف بادشاہ کی اجازت کے تحت ہوسکتا تھا۔ عام افراد کوئی بھی کام آزادانہ طور پر کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے تھے۔ یہ تقریباً وہی صورتِ حال تھی جس کا ایک نمونہ کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ کے تحت قائم شدہ سابق سوویت یونین میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اللہ کو مطلوب تھا کہ سیاسی جبر کے اس غیر فطری نظام کو ختم کر دیا جائے اور زندگی کا پورا نظام اس حالتِ فطری پر قائم ہوجائے جو اللہ نے امتحان کی مصلحت کے تحت انسان کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ یعنی سیاسی اقتدار کی اجازت کے بغیر ہر آدمی آزادانہ طور پر وہ کام کر سکے جس کو وہ کرنا چاہتا ہے۔

اسلام کے دور اول میں ملوکیت کو ختم کر کے خلافت کا قیام اسی عمل کا آغاز تھا۔ یہ نظام سب سے پہلے عرب میں قائم کیا گیا۔ اس وقت کی دنیا میں دو بڑی سلطنتیں ــــــ بازنطینی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر قائم تھیں۔ ان سلطنتوں کے لئے مذکورہ قسم کا اصلاحی پروگرام ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس اصلاحی تحریک کو کچلنا چاہا۔ اس کے نتیجہ میں اصحابِ رسول کا ان سلطنتوں کے ساتھ زبردست مقابلہ پیش آیا۔ اللہ کی مدد سے اس مقابلہ میں اصحابِ رسول کو کامیابی حاصل ہوئی اور اس جبری نظام کا خاتمہ ہوگیا جس کو فرانسیسی مورخ ہنری پرین (Henry Pyrrene) نے مطلق شہنشاہیت (absolute imperialism) کا نام دیا ہے۔

ہزاروں سال سے قائم شدہ جبری نظام کو ختم کر کے آزادی کا نظام قائم کرنا ایک انتہائی انقلابی واقعہ تھا۔ یہ واقعہ اپنے پہلے ہی دور میں مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اللہ کی مدد سے ساتویں صدی عیسوی میں اس قدیم جبری نظام کے تاریخی تسلسل کو توڑ دیا۔ اس کے بعد یہ تبدیلی ایک عمل (process) کے روپ میں انسانی تاریخ میں داخل ہوگئی۔ یہ عمل مختلف قسم کے فطری نشیب و فراز کے ساتھ مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ وہ بیسویں صدی عیسوی میں اپنی آخری تکمیل تک پہنچ گیا۔

عدم ترکیز (de-centralization) کا یہ واقعہ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں پیش آگیا۔ اب سیاسی اقتدار محدود ہوکر صرف انتظامیہ (administration) کی حیثیت میں باقی رہا۔ اب سیاسی ادارہ کا دخل زندگی کے ایک فیصد حصہ تک محدود ہوگیا۔ اور زندگی کے بقیہ ننانوے شعبے اس طرح آزاد ہوگئے کہ ہر انسان اپنی مرضی کے مطابق، ان کو اپنے لئے استعمال کرسکے۔

انسانی زندگی کے نظام میں یہ عظیم تبدیلی عین اسلام کے حق میں تھی۔ اب (دوسروں کی طرح) اہل اسلام کے لئے یہ ممکن ہوگیا کہ سیاسی معنوں میں خواہ وہ حکمراں ہوں یا نہ ہوں، زندگی کی تعمیر و تشکیل میں وہ اپنا ہر منصوبہ کسی رکاوٹ کے بغیر چلاسکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تبدیلی نے زندگی کے نظام کو بادشاہت کے دور سے نکال کر اداروں (institutions) کے دور میں پہنچادیا۔

اب اہل اسلام کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ ہر قسم کے ادارے قائم کرکے زندگی کے تمام شعبوں پر قابض ہوسکیں۔ حتی کہ خود سیاسی ادارہ کو بھی بالواسطہ انداز میں اپنے زیر اثر کرلیں۔

مذکورہ تبدیلی کے بعد یہ ممکن ہوگیا کہ اہل اسلام بڑے پیمانہ پر ہر قسم کے آزادانہ ادارے قائم کریں، اور اداروں کے ذریعہ ـــــ معاشرہ میں وہ نفوذ حاصل کرلیں جو پہلے صرف سیاسی اقتدار کے ذریعہ ممکن ہوا کرتا تھا۔ مثلاً تعلیمی اداروں کے ذریعہ نئی نسلوں کی تربیت، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ عمومی فکری فضا بنانا، کتابوں کے ذریعہ اپنے افکار کی اشاعت، تحقیقی اداروں کے ذریعہ اجتہاد کا عمل جاری رکھنا، مساجد اور مدارس کے ذریعہ اپنے مذہب کی حفاظت، صنعتی اداروں کے ذریعہ مالیات کا حصول، مواصلات کے ذریعہ اپنے مقاصد کی عالمی تنظیم، مختلف قسم کے این جی او (NGOs) کے ذریعہ اپنے مذہبی اور ثقافتی امور کی تنظیم، وغیرہ۔

موجودہ زمانہ میں جن قوموں نے تبدیلی کے اس راز کو سمجھ لیا ہے وہ بظاہر سیاسی اقتدار کی کرسی پر نہ ہوتے ہوئے بھی ہر قسم کی کامیابیاں حاصل کئے ہوئے ہیں۔ کسی گروہ نے ملک کے اندر اپنا تعلیمی ایمپائر بنالیا ہے اور کسی نے صنعتی ایمپائر۔ کسی نے اپنا اشاعتی ایمپائر بنالیا ہے اور کسی نے مواصلاتی ایمپائر۔ کسی نے اپنا مالیاتی ایمپائر بنالیا ہے اور کسی نے معالجاتی ایمپائر۔ اس غیر ریاستی ایمپائر کی آخری

مثال کمپیوٹر ایمپائر ہے جس نے لوگوں کو موقع دیا ہے کہ وہ نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر پورے نظام زندگی کو اپنے کنٹرول میں لے سکیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کی آیت (**ویکون الدین کله لله**) کا ایک اہم پہلو یہی زمانی تبدیلی ہے۔ اس تبدیلی نے سیاسی اقتدار کو گھٹا کر اب اس کو صرف ایک قسم کا سیاسی دردِ سر (political headache) بنا دیا ہے۔ اب اہل اسلام کے لئے ضروری نہیں کہ وہ سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے جنگ کریں۔ سیاسی اقتدار، خواہ جس کسی کے قبضہ میں ہو، وہ ہر حال میں ایسا کر سکتے ہیں کہ غیر سیاسی ادارے قائم کر کے اپنے تمام مطلوب فائدے حاصل کر لیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اہلِ اسلام سیاست سے دست بردار ہو جائیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اداروں اور تنظیموں کے ذریعہ ملنے والے فوائد کو حاصل کرتے ہوئے وہ محدود دائرہ میں پُر امن سیاسی عمل کا طریقہ اپنائیں۔ وہ سیاسی ہنگامہ آرائی سے مکمل پرہیز کرتے ہوئے ممکن دائرہ میں اپنا خاموش سیاسی سفر جاری رکھیں، یہاں تک کہ اللہ ان کے لیے وہ مواقع کھول دے جو انہیں سیاست کے ادارہ تک بھی پہنچا دے۔

امن کی طاقت

حدیث میں آیا ہے: **ان اللہ یعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف** (صحیح مسلم، کتاب البر) یعنی اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔ اس حدیث کے مطابق، پُر امن طریقِ کار (peaceful activism) کو متشددانہ طریقِ عمل (violent activism) کے اوپر واضح فوقیت حاصل ہے۔

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ کوئی پُر اسرار بات نہیں۔ یہ ایک سادہ اور معلوم فطری حقیقت ہے۔ جنگ اور تشدد کی صورتِ حال میں یہ ہوتا ہے کہ طرفین کے درمیان نفرت اور عداوت بھڑکتی ہے۔ موجود ذرائع تباہ ہوتے ہیں۔ دونوں طرف کے بہترین افراد قتل کئے جاتے ہیں۔ پورا سماج منفی نفسیات کا جنگل بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں تعمیر واستحکام کا کوئی کام نہیں کیا

جا سکتا۔ جنگ وتشدد میں نقصان تو یقینی ہے مگر نقصان کے باوجود اس میں کوئی فائدہ نہیں۔

اس کے برعکس امن کا ماحول ہو تو لوگوں کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ دوستی اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ موافق ماحول کے نتیجہ میں تعمیری سرگرمیاں فروغ پاتی ہیں۔ موجود ذرائع کو ترقیاتی کاموں میں استعمال کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ لوگ مثبت نفسیات میں جیتے ہیں جس کی بنا پر علمی اور فکری ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔

جنگ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ مواقع کار کو مسدود کرتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں امن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ مواقعِ کار کو آخری حد تک کھول دیتی ہے۔ جنگ سے ہمیشہ مزید نقصان ہوتا ہے، اور امن سے ہمیشہ مزید فائدہ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ہر قیمت پر اور آخری حد تک جنگ اور ٹکراؤ سے اعراض کی تعلیم دیتا ہے۔ اور امن کو ہر قیمت پر قائم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ایک مغالطہ کی وضاحت

قرآن میں بعض آیتیں ایسی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے: اور ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ (البقرہ ۱۹۱) اس طرح کی آیتوں کو لے کر کچھ لوگ یہ تأثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام جنگ اور قتال کا مذہب ہے۔ یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ اس طرح کی آیتیں محدود طور پر صرف ان لوگوں سے متعلق ہیں جنہوں نے اہل اسلام پر یک طرفہ حملہ کر دیا ہو، وہ اسلام کا کوئی عمومی حکم نہیں۔

اصل یہ ہے کہ قرآن بیک وقت ایک مکمل کتاب کی صورت میں نہیں آیا، بلکہ وہ ۲۳ سال کی مدت میں وقفہ وقفہ کے ساتھ حالات کے مطابق، نازل ہوا۔ ۲۳ سال کی اس مدت کو اگر امن اور جنگ کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے تو تقریباً بیس سال کی مدت امن سے متعلق ہو گی اور تقریباً تین سال کی مدت جنگ سے متعلق۔ جنگ یا قتال کی آیتیں مذکورہ تین سال کے دوران اتریں۔ ان کے علاوہ بیس سال کی مدت میں جو آیتیں اتریں وہ سب کی سب پُر امن تعلیمات سے تعلق رکھتی تھیں۔ مثلاً معرفت، عبادت، اخلاق، عدل، وغیرہ۔

احکام کی یہ تقسیم ایک فطری تقسیم ہے۔ وہ اس قسم کی ہر کتاب میں پائی جاتی ہے۔ مثال کے

طور پر ہندوازم کی مقدس کتاب گیتا کو لیجئے۔ گیتا میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو حکمت اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی کے ساتھ گیتا میں یہ بھی ہے کہ کرشن جی ارجن سے کہتے ہیں کہ اے ارجن، آگے بڑھ اور یُدھ (جنگ) کر۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ گیتا کو ماننے والے بس ہر وقت جنگ کرتے رہیں۔ چنانچہ اسی گیتا سے مہاتما گاندھی نے اپنا اہنسا کا فلسفہ تشکیل دیا۔ کیوں کہ جنگ کی بات گیتا میں استثنائی طور پر حالتِ جنگ کے لئے ہے۔ عمومی زندگی کے لئے اس میں وہی پُر امن احکام بتائے گئے ہیں جو مہاتما گاندھی نے اس سے اخذ کئے۔

اسی طرح بائبل (نیا عہد نامہ) میں حضرت مسیح کی زبان سے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں: یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں (متّی، باب ۱۰)۔ ان الفاظ کا یہ مطلب لینا درست نہ ہوگا کہ حضرت مسیح کا دین جنگ وقتال کا دین تھا۔ اس لئے کہ آپ کی تعلیمات میں اس طرح کی کلام کی حیثیت صرف استثنائی ہے اور کسی خاص موقع سے متعلق ہے۔ جہاں تک عمومی زندگی کا تعلق ہے، حضرت مسیح نے ہمیشہ اخلاق اور محبت جیسی پُر امن قدروں کی تعلیم دی۔

یہی معاملہ قرآن کا بھی ہے۔ پیغمبر اسلام نے جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو اس کے بعد مشرک قبائل نے آپ کے خلاف جارحانہ حملے کرنے شروع کردیے۔ آپ ہمیشہ ان حملوں کو صبر و اعراض کی تدبیروں سے ٹالتے رہے۔ تاہم بعض مواقع پر ایسا ہوا کہ جوابی مقابلہ کے سوا کوئی اور انتخاب (option) موجود ہی نہ تھا۔ اس لئے آپ نے وقتی طور پر ان سے دفاعی جنگ کی۔ یہی وہ حالات تھے جن کے پیش آنے پر قرآن میں جنگ کے استثنائی احکام اترے۔ یہ احکام یقینی طور پر وقتی نوعیت کے تھے، نہ کہ ابدی نوعیت کے۔ چنانچہ قرآن میں پیغمبر اسلام کی مستقل حیثیت کو رحمت للعالمین (الانبیاء ۱۰۷) سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی سارے عالم کے لئے رحمت۔

اسلام میں ٹرر زم نہیں

اسلام کے مطابق، ٹیررزم (دہشت گردی) کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ ٹیررزم سادہ طور پر، غیر ریاستی تشدد کا دوسرا نام ہے۔ تشدد کے ذریعہ کسی مقصد کا حصول، بوقت ضرورت، صرف باقاعدہ

طور پر قائم شدہ حکومت کے لئے درست ہے۔ غیر حکومتی افراد یا جماعتوں کے لئے کسی بھی حال میں اور کسی بھی عذر کی بنا پر تشدد کا طریقہ اختیار کرنا درست نہیں۔ اگر کسی شخص یا گروہ کو کوئی شکایت ہو تو اس کے لئے جائز طور پر صرف دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو وہ پر امن حدود میں رہ کر اپنی شکایت کا حل تلاش کرے، یا وہ اپنے معاملہ کو عدالت اور حکومت کے سپرد کردے تاکہ وہ قانون کے مطابق، دخل دے کر اس کے معاملہ کو حل کریں۔

آج کل میڈیا میں اکثر اسلامک ٹیررزم (اسلامی دہشت گردی) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ یہ بلاشبہہ غلط ہے۔ اسلام کو ٹیررزم کے ساتھ کوئی نسبت نہیں۔ تاہم اس معاملہ میں اصل ذمہ دار میڈیا نہیں ہے بلکہ وہ مسلمان ہیں جو میڈیا کو موقع دیتے ہیں کہ وہ ان کے عمل کو اس قسم کے عنوان کے ساتھ رپورٹ کرے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان مختلف مقامات پر غیر حکومتی جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہ تمام جنگیں یقینی طور پر ملک و مال کے لئے یا مسلم قومی مفاد کے لئے ہیں۔ مگر جو مسلمان اس قسم کی متشددانہ تحریکیں چلا رہے ہیں وہ ان کو اسلامی جہاد کا نام دیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ میڈیا کا کام تجزیہ کرنا نہیں ہے بلکہ رپورٹ کرنا ہے۔ چنانچہ میڈیا مسلمانوں کے اس قسم کے متشددانہ عمل کو اسی طرح اسلام کے ساتھ منسوب کر دیتا ہے جس طرح خود مسلمان ان کو اسلام کے ساتھ منسوب کئے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمان جب اپنے تشدد کو اسلام کا عنوان دیں تو میڈیا بھی اپنی رپورٹنگ میں اس کو اسلام ہی کا عنوان دے گا، نہ کہ کسی اور چیز کا۔

مسلمانوں کی اس روش نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو بہت زیادہ بدنام کیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ساری دنیا میں اسلام کی تصویر خلاف واقعہ طور پر یہ بن گئی ہے کہ اسلام نفرت اور تشدد کا مذہب ہے، نہ کہ امن اور انسانیت کا مذہب۔

مثال کے طور پر ملاحظہ ہو نئی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (یکم اکتوبر ۲۰۰۱) میں مسٹر امولیہ گنگولی کا مضمون اسلام کی تصویر (Image of Islam)۔ اسی طرح لندن کے اخبار ڈیلی ٹیلی گراف

میں شائع شدہ مضمون جس کا عنوان یہ ہے——— ایک مذہب جو تشدد کو جائز قرار دیتا ہے:

A religion that sanctions violence.

اسلام کو اس بدنامی سے بچانے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اپنی قومی لڑائیوں کو اسلام کا عنوان دینا چھوڑ دیں۔ اس معاملہ میں وہ جو کچھ کریں ان کو اپنی قوم کی طرف منسوب کریں، نہ کہ اسلام کی طرف۔ تاکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ان کا اپنا قومی عمل سمجھا جائے، نہ کہ اسلامی اور دینی عمل۔

سوال

چند روز قبل میں اپنے ایک دوست سے سیاسی اقتدار کی حقیقت کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ گفتگو کے دوران میرے دوست نے کہا کہ موسیٰؑ کی دعوت پر فرعون نے کہا تھا کہ یہ (موسیٰ) ہمیں اپنے اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیا فرعون کے اس قول سے سیاسی اقتدار کا نشانہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ فرعون جو موسیٰ علیہ السلام کا مخاطب تھا اس کے اس قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی تحریک سیاسی انقلاب کی تحریک تھی جس سے فرعون اپنے لئے سیاسی خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اس بنا پر اس نے ایسا کہا۔ (جاوید حسین وانی، اننت ناگ، کشمیر)

جواب

فرعون کا قول ''یرید أن یخرجکم من أرضکم'' الأعراف اور الشعراء میں آیا ہے۔ اس آیت سے یہ نظریہ نکالنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مشن ایک سیاسی مشن تھا، بلاشبہہ ایک مجرمانہ جسارت کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ یہ فرعون کے قول سے موسیٰ علیہ السلام کا مشن نکالنا ہے۔ جب کہ حضرت موسیٰ کا پیغمبرانہ مشن قولِ موسیٰ سے نکلے گا، نہ کہ قولِ فرعون سے۔ استدلال کا یہ طریقہ نہایت غیر منطقی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کشمیریوں کے ایک مخالف شخص کے قول سے کشمیریوں کا مقصد متعین کیا جائے۔ اپنے ذاتی معاملہ میں کوئی بھی اس قسم کے غیر منطقی استدلال کو تسلیم نہیں کرے گا۔ پھر قرآن کے معاملہ میں ایسا استدلال کیوں کر درست ہوسکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اگر حضرت موسیٰ کا مقصد یہ تھا کہ فرعون کو تخت سے بے دخل کر کے مصر میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کریں تو حضرت موسیٰ نے نعوذ باللہ، خود اپنے مشن کے خلاف عمل کیا۔ کیوں کہ جب فرعون اور اس کا لشکر مکمل طور پر تباہ ہو گیا تو اس کے بعد حضرت موسیٰ کے لئے بہترین موقع تھا کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ واپس آکر مصر کے اقتدار پر قبضہ کرلیں۔ مگر اس کے برعکس حضرت موسیٰ نے یہ کیا کہ وہ مصر کو چھوڑ کر اپنی قوم کے ساتھ صحرائے سینا کے غیر آباد علاقے میں چلے گئے۔ مذکورہ سیاسی تفسیر کو ماننے کی صورت میں حضرت موسیٰ کے اس عمل کی کوئی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔

اس قسم کے واضح حقائق کے باوجود جو لوگ حضرت موسیٰ کے مشن کو سیاسی مشن بتائیں وہ صرف اس قابل ہیں کہ ان کے ساتھ قرآن کے اس حکم پر عمل کیا جائے: **واعرض عن الجاهلين۔**

سوال

میں دبئ میں رہتا ہوں۔ وہاں میری ملاقات اکثر پاکستانی لوگوں سے ہوتی ہے۔ ان کو میں ماہنامہ الرسالہ اور الرسالہ کی دوسری مطبوعات پڑھنے کو دیتا ہوں۔ یہ لوگ عام طور پر اس کو پسند کرتے ہیں مگر اکثر پاکستانی مسلمان ایک شبہہ کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب تک ہم یہ جانتے تھے کہ اسلام کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ ایک مکمل سیاسی نظام ہے۔ اور ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم جہاد کر کے اس سیاسی نظام کو قائم کریں۔ مگر الرسالہ اور الرسالہ مطبوعات میں ہم کو اسلام کا یہ تصور نہیں ملتا۔ آخر یہ فرق کیوں ہے۔ (ادریس محمد انصاری، دبئ)

جواب

یہ صرف پاکستانیوں کا مسئلہ نہیں۔ موجودہ زمانہ کے اکثر مسلمان اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اسلام ایک سیاسی نظام ہے اور جہاد کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں سے لڑ کر اس سیاسی نظام کو قائم کیا جائے۔ مگر یہ ایک سیاسی بدعت ہے جو موجودہ زمانہ کے نام نہاد انقلابی مفکرین نے پھیلائی ہے۔ انہوں نے اسلام کو گھٹا کر اس کو صرف ایک سیاسی نظام بنا دیا ہے۔

They have reduced Islam to a mere political system.

اسلام کا یہ سیاسی تصور صرف ایک ردّ عمل ہے جو موجودہ حالات کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ وہ یقینی طور پر قرآن اور سنت سے ماخوذ نہیں۔ قرآن وسنت کے مطابق، اسلام ایک ربانی نظام کا نام ہے، نہ کہ کسی سیاسی نظام کا نام (آل عمران ۷۹)

اسلام کا مقصد ہر انسان کے دل میں اللہ کا خوف اور محبت پیدا کرنا ہے، نہ کہ اسلامی سیاست کے قیام کے نام پر حکمرانوں سے لڑائی چھیڑنا اور پورے سماج کو تشدد کا جنگل بنا دینا۔ جیسا کہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد انقلابی مفکرین کے پیرو دنیا کے بہت سے ملکوں اور علاقوں میں انجام دے رہے ہیں۔

یہ نام نہاد اسلامی سیاست ہر جگہ عملاً وہی چیز بن گئی ہے جو قرآنی اصول کے مطابق، ایک فسادی سیاست ہے (البقرہ ۲۰۵)۔

اسلام کا آغاز اللہ کی ذاتی معرفت سے ہوتا ہے۔ اسلام ایک ایسے شعوری واقعہ کا نام ہے جب کہ ایک آدمی اللہ کو اس کی ذات اور صفات کے ساتھ دریافت کرے اور اپنے قلب اور دماغ کے ساتھ اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جائے۔ وہ اللہ کو اپنا سب کچھ بنا لے۔

اسلام کی معرفت یا اسلام کی دریافت کے بعد آدمی کے اندر ایک زبردست تبدیلی آتی ہے۔ وہ اللہ کو یاد کرنے والا بن جاتا ہے۔ وہ اپنے نفع اور نقصان، اپنی نفرت اور محبت، غرض اپنے ہر قول اور فعل کو اللہ کے لئے خاص کر دیتا ہے۔ وہ غیر اللہ سے یکسو ہو کر صرف ایک اللہ کا عبادت گزار بن جاتا ہے۔

اسی طرح اس کا اجتماعی سلوک مکمل طور پر اللہ کے تابع ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا اخلاق، لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات، لوگوں کے ساتھ اس کا لین دین، سب اللہ کے حکم کی روشنی میں انجام پانے لگتے ہیں۔ اس کے ہر قول اور اس کے ہر فعل میں اللہ کا رنگ غالب آ جاتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے خاندان کے اندر خاندان کا ایک اچھا ممبر بن جاتا ہے۔ سماج کے اندر وہ اس کے ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ملک کے اندر وہ قانون کی پابندی کرنے والا اور اپنی ڈیوٹی انجام دینے والا ایک شہری بن جاتا ہے۔ زندگی کی جس سطح پر بھی دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہوتا ہے وہ لوگوں کے لئے ایک سچا انسان ثابت ہوتا ہے۔ یہی اصل اسلام ہے۔

جہاں تک حکومت اور اقتدار کا تعلق ہے، وہ قرآن کے مطابق، امر مقصود نہیں، بلکہ وہ امر موعود ہے۔ (النور ۵۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کا حصول اسلامی تحریک کا نشانہ نہیں ہے۔ اسلامی تحریک کا نشانہ اصلاً صرف دو چیزیں ہیں ـــــ اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا اور جو لوگ اللہ کے پیغام کو قبول کر لیں ان کی تعلیم و تربیت کرنا (لتنذر بہ و ذکریٰ للمؤمنین) قرآن کے مطابق، سیاسی اقتدار امتحان کے پرچوں میں سے ایک پرچہ ہے۔ جس طرح مال کسی ایک ہی شخص یا ایک ہی گروہ کو نہیں

دیا جاتا بلکہ ہر ایک کو دیا جاتا ہے تاکہ ہر ایک کی آزمائش ہو سکے۔ یہی معاملہ سیاسی اقتدار کا بھی ہے۔ سیاسی اقتدار بھی مختلف لوگوں کو باری باری دیا جاتا ہے۔ سیاسی اقتدار کسی فرد یا گروہ کی ابدی وراثت نہیں۔ کسی ایک کو مستقل طور پر سیاسی اقتدار کا مالک بنانا گویا دوسروں کو سیاسی آزمائش سے بری کرنا ہے۔

یہ اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔ قرآن کے مطابق، فتح و شکست اور سیاسی غلبہ اور سیاسی مغلوبیت باری باری کبھی ایک کے حصہ میں آتی ہیں اور کبھی دوسرے کے حصہ میں **(تلک الایام نداولھا بین الناس)**

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اقتدار کے معاملہ کو أخوی (الصّف ۱۳) کہا گیا ہے۔ یعنی اصل اُخروی مطلوب کے علاوہ ایک اور چیز جو دنیوی حالات کے لحاظ سے درکار ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سیاسی غلبہ یا سیاسی اقتدار کی حیثیت اسلام میں اضافی ہے، نہ کہ حقیقی۔

سوال

الرسالہ جون ۲۰۰۱ کے شمارہ میں ایک چیز میرے ذہن کو بہت زیادہ کھٹک رہی ہے۔ صفحہ ۴۶ پر آپ نے لکھا ہے کہ ''گجرات میں غیر معمولی تباہی کا سبب یہ تھا کہ پچھلے برسوں میں وہاں کثرت سے ایسے مکانات بنائے گئے جن کو (non-engineered construction) کہا جاتا ہے۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں ثابت شدہ طریقہ یہ ہے کہ جس مقام میں معلوم طور پر زلزلہ آنے کا امکان ہو وہاں quake resistant مکان بنائے جائیں۔ اس طرح گجرات کی آفت کے ذریعہ قدرت کی طرف سے گویا یہ پیغام دیا گیا ہے کہ لوگ اپنے مکانات فن تعمیر کے اصول کے مطابق بنائیں''۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ خدا کے پاس ''کن فیکون'' کی ابدی طاقت ہے، اس کے نزدیک non-engineered construction اور quake resistant کا کوئی فرق نہیں، جو خدا قوم عاد اور قوم ثمود کے محلات کو تاخت و تاراج کرسکتا ہے جو ''**ارم ذات العماد لم یخلق مثلھا فی البلاد**'' تھے، اس ذات قہار کے نزدیک مذکورہ باتیں چہ معنی دارد است؟ (جمیل احمد عباس، چکنوٹہ، ویشالی، بہار)

جواب

الرسالہ میں جو بات لکھی گئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ خدائی عذاب کے مقابلہ میں کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دو چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک ہے، نظام فطرت کے تحت پیش آنے والے عام مسائل۔ اور دوسری چیز ہے، اللہ کے فیصلہ کے تحت پیش آنے والا غیر معمولی واقعہ جس کو عذاب کہا جاتا ہے۔ الرسالہ کے مذکورہ شمارہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ اول الذکر صورت حال سے متعلق ہے، نہ کہ ثانی الذکر صورت حال سے متعلق۔

برسات کی بارش سے بچنے کے لئے آپ چھت بناتے ہیں اور وہ چھت آپ کو بارش کے مسائل سے محفوظ رکھتی ہے۔ مگر قوم عاد پر عذاب کی جو بارش برسائی گئی، کوئی بھی چھت انسان کو اس سے محفوظ نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی طرح مخصوص حکمت کے تحت اللہ نے زمین کے اندر نہایت گرم لاوا رکھا ہے۔ اس کی مسلسل حرکت سے زمین پر ہر روز زلزلے آتے ہیں۔ عام حالات میں یہ زلزلے اتنے خفیف ہوتے ہیں کہ صرف آلات کی مدد سے ان کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ان میں تیزی آجاتی ہے اور زمین کے اوپر کا حصہ ہلنے لگتا ہے اس وقت ہم اس کو زلزلہ کہتے ہیں۔

جس طرح دوسرے فطری مسائل کے مقابلہ میں ہم بچاؤ کا انتظام کرتے ہیں۔ مثلاً بارش سے مقابلہ کے لیے چھت، سیلاب سے مقابلہ کے لیے بند، گرمی سے مقابلہ کے لیے سایہ، سرد موسم سے مقابلہ کے لیے گرم کپڑا، وغیرہ۔ اسی طرح زلزلہ سے مقابلہ کے لیے بھی مطالعہ اور تجربہ کے بعد مخصوص ٹکنیک دریافت کی گئی ہے اور اس کے استعمال سے مختلف ملکوں میں بچاؤ کا سامان کیا گیا ہے۔

مگر عذاب کا معاملہ اس قسم کے فطری مسائل سے نوعی طور پر مختلف ہے۔ عذاب ایک فیصلۂ الٰہی ہوتا ہے جو بہر حال واقع ہو کر رہتا ہے۔ مگر ہم کو یہ حق نہیں کہ ذاتی قیاس کے تحت ہم کسی واقعہ کو عذابِ الٰہی کہیں۔ اس قسم کا اعلان صرف پیغمبر براہِ راست خدائی اطلاع کی بنا پر کر سکتا تھا۔ پیغمبر کے بعد اب کسی واقعہ کو خدا کا عذاب کہنا ایک ایسی جسارت ہے جس کا تحمل اللہ سے ڈرنے والا کوئی انسان نہیں کر سکتا۔

سوال

خدا کی حقیقت (وجود) سب سے افضل مانی جاتی ہے۔لیکن شیطان برائی کرنے کے لیے انسان کو اکساتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے۔مگر خدا بے بس لگتا ہے۔شیطان کیسے خدا کے برابر طاقتور ہے۔(بلراج اوبرائے، ریٹائرڈ جج، میرٹھ)

جواب

خدا انسان کا خالق ہے۔خدا بلاشبہہ تمام طاقتوں کا مالک ہے۔شیطان کو دنیا میں بظاہر انسان کے اوپر جو اختیار حاصل ہے اس کا تعلق خدا کی طاقت سے نہیں ہے بلکہ خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) سے ہے۔شیطان کو موجودہ دنیا میں جو اختیار حاصل ہے وہ اس لیے ہے کہ خدا نے اپنی امتحانی مصلحت کی بنا پر وقتی طور پر اس کو یہ موقع دیا ہے۔شیطان کا اختیار اس کی ذاتی صفت نہیں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کو خدا نے آزمائش (test) کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔یہاں انسان کو اس لیے بسایا گیا ہے کہ اس کو جانچ کر دیکھا جائے اور یہ فیصلہ کیا جائے کہ کون انسان اپنے حسن عمل کی بنا پر اس قابل ہے کہ اس کو جنت کی ابدی دنیا میں بسایا جائے اور جو لوگ اپنی بدعملی کی بنا پر نالائق ثابت ہوں ان کو جنت سے محروم کر کے کائنات کے ابدی کوڑا خانہ میں ڈال دیا جائے۔

موجودہ دنیا کا پورا نظام اسی آزمائشی مصلحت کے تحت بنایا گیا ہے۔موجودہ دنیا کی صحیح توجیہہ صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ اس کو اسی روشنی میں دیکھا جائے اور اس کے واقعات کی توجیہہ اسی بنیادی اصول کی روشنی میں کی جائے۔مثلاً انسان کو موجودہ دنیا میں جو اختیار ملا ہوا ہے وہ بھی اسی آزمائشی مصلحت کی بنا پر ہے۔انسان کے اندر صحیح اور غلط کی تمیز کی جو صلاحیت ہے اس کا راز بھی یہی ہے۔انھی میں سے ایک شیطان کا وجود بھی ہے۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق، شیطان خفیہ نوعیت کی ایک مستقل مخلوق ہے۔شیطان یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ انسان کو بہکائے۔وہ انسان کو اس طرح متاثر کرے کہ برائی اس کو خوبصورت دکھائی دے، اور بھلائی اس کو بُری صورت میں نظر آئے۔مگر شیطان کو انسان کے اوپر صرف بہکانے کا اختیار حاصل

ہے۔ شیطان کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ انسان کے ساتھ زبردستی کرے یا اس کو غلط راستہ پر چلنے کے لیے مجبور کر سکے۔

موجودہ دنیا میں انسان کا معاملہ ویسا ہی ہے جیسے امتحان ہال میں کسی طالب علم کا معاملہ۔ طالب علم کو امتحان ہال میں مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنی کاپی پر جو چاہے لکھے اور جو چاہے نہ لکھے۔ مگر یہ آزادی صرف تین گھنٹہ کے لیے ہے۔ تین گھنٹے کا وقت پورا ہوتے ہی اس کی کاپی واپس لے لی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کے تعلیمی مستقبل کا فیصلہ اس کی اسی کارگذاری پر کیا جاتا ہے جو اس نے تین گھنٹے کے ملے ہوئے وقت میں انجام دی تھی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسان کا موجودہ دنیا میں ہے۔ کسی انسان کو عمر کا جو وقفہ ملا ہے وہ گویا اس کے لیے تین گھنٹہ کا وقفہ ہے۔ اس وقفۂ عمل کے دوران اس کو موقع ہے کہ وہ یا تو شیطان کے بہکاوے میں آکر اپنا اعمال نامہ خراب کرلے، یا اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے اپنے آپ کو شیطان کے بہکاوے سے بچائے۔ وہ شیطان کو رد کرکے فرشتہ کی آواز کو سنے اور سچائی کے راستہ پر قائم ہو جائے۔ جو لوگ فرشتہ کی آواز کو سنیں اور اس کی پیروی کریں ان کے لیے خدا کا ابدی انعام ہے، اور جو لوگ شیطان کی آواز کو سنیں اور اس کی پیروی کریں ان کے لیے خدا کی ابدی سزا۔

شیطان کے بارے میں مذکورہ سوال صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ موجودہ دنیا ہی کو واحد دنیا سمجھا جائے۔ مگر جب موجودہ دنیا کے ساتھ آخرت کی دنیا کو ملا لیا جائے تو یہ سوال اپنے آپ حل ہو جاتا ہے۔ موجودہ دنیا کو آخرت کی دنیا سے ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور آخرت کی دنیا اس کا بدلہ پانے کی جگہ۔ آخرت کی دنیا میں جو اعلیٰ انعام دیا جانے والا ہے وہ بے حد قیمتی ہے۔ اس قیمتی انعام کے مستحق صرف وہ بلند حوصلہ افراد ہوں گے جو شیطان کی ترغیبات (temptations) سے اپنے آپ کو بچائیں اور ہر ممکن قربانی دیتے ہوئے سچائی کے راستہ پر قائم رہیں۔ جن کی موت اس حال میں آئے کہ انہوں نے شیطان کے اوپر مکمل غلبہ پا لیا تھا۔

سوال

میں الرسالہ کا قاری ہوں۔ الرسالہ، مارچ ۱۹۶۵ میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں یہ درج تھا کہ ''بندہ نے رمضان میں ایک مہینہ تک اللہ کے حکم کی تعمیل کی، تو اب اللہ نے اس کو قبول کرتے ہوئے اپنے انعام کے طور پر بندہ کو یہ موقع دیا کہ وہ پابندیوں سے آزاد ہو کر جو چاہے کھائے اور جو چاہے پئے'' (صفحہ ۱۸)۔ اس عبارت پر کچھ لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حرام وحلال کی تمیز کئے بغیر جو چاہے کھاؤ جو چاہئے پیئو۔ میری سمجھ سے اس عبارت کو اس طرح ہونا چاہئے تھا: ''پابندیوں سے آزاد ہو کر اللہ کے دیے ہوئے مال حلال سے جو چاہے کھائے اور جو چاہے پئے۔'' اگر عبارت اس طرح ہوتی تو لوگوں کو اعتراض کا موقع نہ ملتا۔ (سید آصف علی، پوسٹ بکس ۲۴۸۰۴، شارجہ)

جواب

یہ معاملہ عبارت میں غلطی کا نہیں ہے، بلکہ یہ ان لوگوں کی سوچ کی غلطی کا معاملہ ہے جن لوگوں نے یہ اعتراض کیا۔ اگر کھلے ذہن کے ساتھ اس مضمون کو پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود اسی مضمون میں مذکورہ اعتراض کا جواب موجود ہے۔ آپ دوبارہ پورے مضمون کو پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں چند سطر پہلے یہ الفاظ چھپے ہوئے موجود ہیں، ''رمضان کا مہینہ کھانے پینے پر پابندی لگانے کا مہینہ ہے اور عید الفطر کا دن ان پابندیوں سے آزاد ہونے کا دن ہے''۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ''پابندیوں سے آزادی'' سے مراد وہ پابندیاں ہیں جو روزہ کے دنوں میں عائد کی گئی تھیں، نہ کہ مطلق آزادی۔

یہ اعتراض نہیں ہے بلکہ شوشہ ہے۔ اور شوشہ ہر عبارت میں نکالا جا سکتا ہے، حتی کہ قرآن میں بھی، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے: واذا علم من آیاتنا شیئا اتخذھا ھزواً (الجاثیہ ۹)

سوال

میری ملاقات ایک جماعت کے لوگوں سے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ وہ آپ پر نکتہ چینی کرتے

ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ دعوت کی بات کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ نے کتنے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا ہے۔ الرسالہ کے خبر نامہ اسلامی مرکز میں تو ایسی خبریں موجود نہیں ہوتیں۔ (اقبال احمد فیضی، بھلائی)

جواب

سوال کرنے والے کے اندر اگر سنجیدگی ہو تو وہ اس سوال کا جواب خود ہی معلوم کر سکتا ہے۔ ہمارا مشن تقریباً چالیس سال سے چل رہا ہے۔ اس مدت میں اللہ کے فضل سے ہم نے مختلف ملکوں کے لاکھوں انسانوں تک اسلام کا پیغام پہنچایا ہے۔ ان میں سے ہزاروں لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں، **فالحمد لله علی ذلک**۔ مگر میں اور میرے ساتھی یہ کام صرف اللہ کی رضا کے لیے کر رہے ہیں اس لیے ہم اس کو خبر نامہ میں نہیں چھاپتے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس جماعت کے لوگ آپ سے اس قسم کے سوالات کرتے ہیں وہ اپنے نظریہ کے مطابق، اس ملک کو دار الطاغوت سمجھتے رہے ہیں۔ اب وہ اس ملک کو دار الدعوہ کہتے ہیں اور اپنے دعوے کے مطابق، دعوتی کام میں مصروف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ دار الدعوہ کا یہ تصور ان کو کہاں سے ملا۔ یقینی طور پر وہ انہیں راقم الحروف کی تحریروں سے ملا۔ ان کے اپنے جماعتی نظریہ کے مطابق، تو یہ ملک ان کے لیے صرف دار الطاغوت تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ان کے لیے صرف یہ ممکن تھا کہ وہ اس طاغوتی نظام سے لڑیں۔ پھر یا تو اسی راہ میں اپنی جان دے دیں یا اس کو اسلامی نظام میں تبدیل کر دیں۔ ان کے مسلمہ عقیدہ کے مطابق، سیاسی نظام کو بدلے بغیر دعوت کے کام کا انجام پانا ممکن ہی نہیں۔

راقم الحروف نے اللہ کی توفیق سے، ان حضرات کو بتایا کہ جس ملک کو تم غلط طور پر دار الطاغوت سمجھتے ہو وہ دراصل دار الدعوہ ہے یعنی یہاں آج بھی پُرامن انداز میں دعوت کا عمل انجام دیا جا سکتا ہے۔

ان حضرات کے نظریہ کے مطابق، ہندستان جیسے ملک میں ان کے لیے صرف دو ہی امکانی صورت تھی۔ ایک یہ کہ مفروضہ طاغوتی نظام سے لڑ کر اپنے کو ہلاک کرنا، یا منافقانہ سمجھوتہ کر کے اس کے

اندر زندگی گزارنا۔ راقم الحروف نے اللہ کی توفیق سے ان کو اس دوطرفہ مصیبت سے نجات دی۔ ایسی حالت میں یہ حضرات میرے خلاف جو بے بنیاد پروپیگنڈہ کرتے ہیں وہ بے حد سنگین ہے۔ اندیشہ ہے کہ ان کی یہ روش انہیں اس حدیث رسول کا مصداق بنا دے: **من لم يشكر الناس لم يشكر الله** (احمد، الترمذی، بحوالہ مشکاۃ المصابیح، جلد ۲ صفحہ ۹۱۱)

سوال

قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ کاذبوں کو ڈھیل نہیں دیتا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ ــــــاور وہ کوئی بات گھڑ کر ہمارے اوپر لگاتا۔ تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑتے۔ پھر ہم اس کی رگِ دل کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی اس سے ہم کو روکنے والا نہ ہوتا۔ (الحاقۃ ۴۴۔۴۷) اس صورت میں اگر مرزا غلام احمد قادیانی صاحب جھوٹے تھے تو کیا وجہ ہے کہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی گرفت نہیں کی؟ (بہادر خاں، بارہ مولہ، جموں و کشمیر)

جواب

یہ ایک مغالطہ ہے، نہ کہ استدلال۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ "جو لوگ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کریں" بلکہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ "اگر وہ بات گھڑتا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کا تعلق صرف ایک شخص، یعنی محمد بن عبداللہ سے ہے۔ اس آیت میں کوئی عام حکم بیان نہیں ہوا ہے۔ اس کا تعلق متعین طور پر ذات رسول سے ہے۔ آپ کے معاصرین آپ کے بارے میں اس قسم کا الزام لگاتے تھے، اس لیے اُن کے جواب میں یہ آیت اتاری گئی۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اقرار یا انکار سے آپ کے معاصرین کی جنت یا جہنم کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس لیے آپ کے بارے میں یہ سخت اعلان کیا گیا۔ جہاں تک جھوٹے مدعیان نبوت کا تعلق ہے ان کے مخاطبین کے بارے میں اللہ کی یہ سنت نہیں۔ ان لوگوں کا فیصلہ آخرت میں ہوگا، نہ کہ دنیا میں۔

سوال

میں بہار کے ایک میڈیکل کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی کا طالب علم ہوں۔ یہ ایک اقلیتی

ادارہ ہے جس میں ۵۰ فیصد سیٹ مسلمانوں کے لیے ریزرو ہے۔ یہ کالج A.I.C.T.E سے ریکگنائزڈ ہے اور وقتی طور پر مگدھ یونیورسٹی سے اس کا الحاق بھی ہے۔ مگر یونیورسٹی لڑکوں کا امتحان وقت پر نہیں لیتی۔ یونیورسٹی بار بار الزام عائد کرتی ہے کہ کالج ریگولر طریقہ پر نہیں چلتا ہے۔ اس لیے اس کا کوئی کام وقت پر کرنا مناسب نہیں۔ جب کہ کالج انتظامیہ کا کہنا ہے کہ یونیورسٹی خود بدعنوانی کا شکار ہے۔ میں دو سال سے فرسٹ ایر میں ہوں مگر ابھی تک امتحان ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اس کے متعلق کئی بار گورنر اور وائس چانسلر سے بات ہو چکی ہے پھر بھی کوئی مثبت جواب نہیں مل پایا۔ اس حال میں ہم لوگوں کو کیا کرنا چاہئے۔ برائے کرم آپ کوئی مشورہ دیں (خالد علی خاں، بہار)

جواب

میں ذاتی طور پر رعایتی ادارے قائم کرنے کے خلاف ہوں۔ اور رعایتی داخلہ کے بھی خلاف ہوں۔ میرے نزدیک زندگی مقابلہ کا نام ہے۔ اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ مقابلہ کرو یا ختم ہو جاؤ: compete or perish۔

میرا مشورہ ہے کہ آپ اب سے یہ فیصلہ کریں کہ آپ محنت کے ذریعہ دنیا میں اپنا مقام بنائیں گے، نہ کہ رعایت کے ذریعہ۔ شکایت ہمیشہ رعایت چاہنے والوں کو ہوتی ہے۔ جو لوگ محنت کا طریقہ اختیار کریں، انہیں کبھی کسی سے شکایت نہیں ہوتی۔ جو لوگ رعایتی ادارے کھولتے ہیں، ریزرویشن کی اہمیت پر تقریریں کرتے ہیں وہ خود اپنے بچوں کو ایسے تعلیمی اداروں میں داخل کرتے ہیں جہاں سخت مقابلہ کا ماحول ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا اصل مسئلہ کسی نہ کسی طرح ڈگری حاصل کرنے کا نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ زندگی میں ترقی کرنے کا ہے۔

زندگی میں اعلیٰ ترقی کبھی رعایت اور رزرویشن کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ اعلیٰ لیاقت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اور اعلیٰ لیاقت محنت سے آتی ہے، نہ کہ رعایت سے۔

سوال

الرسالہ میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ظلم و زیادتی کے خلاف مسلمانوں کو صبر کی روش اختیار کرنا

چاہئے۔اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ظلم وزیادتی پرصبر کرنا توظلم وزیادتی کو بڑھاوا دینا ہے۔ اس شبہہ کا کیا جواب ہے۔(ندیم احمد سنابلی، دہلی)

جواب

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ کہ قرآن میں پیغمبروں کی زبان سے ارشاد ہوا ہے کہ: ولنصبرن علی ما آذیتمونا (ابراہیم ۱۲) یعنی تمہاری ایذاؤں پر ہم صبر ہی کریں گے۔اگر ظلم وزیادتی پرصبر کرنا اس کو بڑھاوا دینے کے ہم معنیٰ ہوتا تو پیغمبروں کو کبھی اللہ کی طرف سے یہ تعلیم نہ دی جاتی جو مذکورہ آیت کے مطابق، انہیں دی گئی۔

اصل یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو لوگ عام طور پراس کے خلاف جوابی تدبیر کو تدبیر سمجھتے ہیں مگر یہ صرف ایک جذباتی ردّعمل ہے۔جس کا نتیجہ ہمیشہ الٹا نکلتا ہے۔ایسے مواقع پر جوابی تدبیر صرف مسئلہ کو بڑھاتی ہے۔ وہ فریق ثانی کے اندر ضد اور انتقام کی آگ بھڑکا کر مسئلہ کو شدید تر بنا دیتی ہے۔وہ کسی حال میں مسئلہ کا حل نہیں۔

صبر کا مطلب عدم عمل نہیں،صبر کا مطلب زیادہ مؤثر عمل ہے۔صبر اور بے صبری میں یہ فرق ہے کہ بے صبر آدمی پیش آمدہ مسئلہ کو جذباتی تدبیر کے ذریعہ حل کرنا چاہتا ہے۔اس کے مقابلہ میں صبر والا آدمی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ مسئلہ کا حل نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ بے صبری کا طریقہ ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور صبر کا طریقہ ہمیشہ کامیاب۔

اس معاملہ کی ایک معلوم اور معروف مثال یہ ہے کہ ہر سال ہندو لوگوں کی طرف سے گن پتی کا جلوس نکلتا ہے۔ابتداءً مسلمان یہ کرتے تھے کہ گن پتی کا جلوس جب ان کی مسجد کے سامنے سے گذرتا تو وہ روک ٹوک کرتے۔ وہ جلوس کی روٹ بدلنے کی مانگ کرتے۔اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا اور خونی فساد کی نوبت آجاتی۔اب اللہ کا فضل ہے کہ الرسالہ کی تعمیری مہم کے نتیجہ میں اس معاملہ میں مسلمان صبر واعراض کی حکمت کو سمجھ گئے ہیں۔چنانچہ اب بھی ہر سال پہلے کی طرح گن پتی کا جلوس نکلتا ہے۔جلوس والے اب بھی وہی کرتے ہیں جو وہ پہلے کرتے تھے۔مگر اب

کئی سالوں سے گن پتی کے جلوس کے موقع پر فرقہ وارانہ فساد کا ہونا تقریباً بند ہو گیا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اب مسلمان گن پتی کے جلوس کے موقع پر صبر و اعراض کا فارمولہ اختیار کرتے ہیں، جب کہ اس سے پہلے وہ بے صبری اور جذباتیت کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔

سوال

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے مسائل میں صحابہ کی روایتوں میں اختلاف ہے۔ مثلاً بعض روایتوں میں سینے پر ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے اور بعض دوسری روایتوں میں ناف کے نیچے باندھنے کا۔ اس طرح کے اختلافات کی موجودگی میں **صلوا کما رأیتمونی اصلی** کے حکم پر کس طرح عمل کیا جائے گا۔ (محمد امین گڈّو، سری نگر، کشمیر)

جواب

اس طرح کے اختلافات سے معلوم ہوتا ہے کہ آداب نماز میں توسع کا اصول ہے۔ اس لئے توحد کے اصول پر کوئی ایک نمونہ قائم کرنے کی کوشش درست نہیں۔ امام شافعی نے بجا طور پر کہا ہے کہ **رأی صواب یحتمل الخطاء ورأی غیری خطأ یحتمل الصواب**۔ میری رائے درست ہے احتمال خطا کے ساتھ اور فریق ثانی کی رائے غلط ہے احتمال صواب کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں روایتوں کے اختلاف کو ایک ثابت کرنے کی ساری کوشش کے باوجود صرف احتمال ثابت ہوتا ہے تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس اختلاف کو توسع پر محمول کیا جائے۔ اور میرے نزدیک یہی محدثین کا مسلک تھا۔

نماز اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خشوع کا ایک عمل ہے نہ کہ محض کچھ ظواہر کی صحت ادائیگی کا عمل۔ ایسی حالت میں ظاہری آداب میں فرق ہونا ایک فطری بات ہے۔ نمازی کو چاہئے کہ اپنا سارا دھیان داخلی کیفیت پر دے، نہ کہ ظاہری ہیئت پر۔ چنانچہ ظاہری ہیئت کی صحت ادائیگی کے باوجود ایک شخص کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: **ارجع فصلّ فإنک لم تصل** (جاؤ پھر سے نماز پڑھو، کیوں کہ تم نے نماز نہیں پڑھی)۔

ایک خط

برادر محترم شمشاد محمد خان صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے ٹیلی فون ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۱ کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ برمنگھم کے زمانہ قیام میں ۲۲ ستمبر ۲۰۰۱ کو آپ سے جس خواب کا ذکر ہوا تھا، آپ کی ہدایت کے مطابق، اس کو روانہ کر رہا ہوں۔ یہ خواب میں نے تین سال پہلے دہلی میں دیکھا تھا۔ ڈائری سے لے کر یہ خواب لفظ بلفظ یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

''۲۱ ستمبر ۱۹۹۸ کی رات کو میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں نے یہ دیکھا کہ ایک بڑا کمرہ ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرش پر لیٹے ہوئے ہیں۔ وہ چت لیٹے ہیں۔ جسم پر سفید کپڑے ہیں۔ بھاری بدن ہے۔ آس پاس بہت سے لوگ ہیں مگر وہ کسی کی طرف مخاطب نہیں ہیں۔ بظاہر گہری فکر میں ہیں۔ جاگ رہے ہیں۔ غالباً آنکھیں بند ہیں۔ میں ان کے بہت قریب بیٹھا ہوا ہوں۔ اتنے میں بغیر کسی تمہید کے رسول اللہ نے بولنا شروع کیا۔ وہ اردو میں بول رہے تھے۔ وہ افغانستان اور افغانیوں کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ بہت رک رک کر الفاظ ادا کر رہے تھے۔ میں نے فوراً اس کو لکھنا شروع کیا۔ میں نے دو سطریں لکھی تھیں کہ خیال آیا کہ میرے پاس اچھا کاغذ نہیں ہے۔ میں دوڑ کر اوپر کی منزل پر گیا تا کہ اپنے کمرہ سے دوسرا کاغذ اور قلم لے آؤں۔ مگر کسی وجہ سے مجھے دیر ہوگئی اور جب میں دوبارہ رسول اللہ کے پاس پہنچا تو آپ بول کر خاموش ہو چکے تھے۔ میں بے چین ہو گیا کہ میں آپ کی پوری بات کو نہ لکھ سکا۔ وہاں جو لوگ تھے میں نے دیکھا کہ کوئی بھی شخص رسول اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک ادھر ادھر مشغول ہے۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا کہ کیا کسی نے رسول اللہ کی بات کو لکھا ہے۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے کہ وہ میرے سوال کو غیر اہم سمجھ رہے ہوں۔ کئی بار پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ایک شخص نے آپ کی بات لکھی ہے مگر وہ بالمعنیٰ

طور پر ہے۔ میں چاہتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات آپ ہی کے اپنے الفاظ میں ہو حتی کہ اس کا گریمیٹکل آرڈر بھی نہ بدلا جائے۔ مگر جس آدمی نے آپ کی بات لکھی اس نے ان چیزوں کو زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے رسول اللہ کی بات کو اپنے الفاظ میں لکھ لیا۔ اب میرے پاس صرف دو سطریں باقی رہیں جو میں نے شروع میں لکھا تھا۔ نیند کھلی تو رسول اللہ کے الفاظ یاد نہ تھے۔ مفہوم کے اعتبار سے آپ کی بات یہ تھی کہ آپ نے گہرے رنج کے ساتھ افغانیوں کے موجودہ جنگجویانہ عمل کی مذمت کی۔ اس کو غیر اسلامی بتایا اور اس کو اسلام کے نام پر سرکشی قرار دیا (مفہوم)۔

میں نے جو دو سطریں لکھی تھیں اس میں میں نے پہلا جملہ تھوڑا سا بدل کر صحیح گریمیٹکل آرڈر میں لکھا تھا۔ بعد کو خیال آیا کہ آپ کی بات ویسی کی ویسی ہی ہونی چاہئے تو میں نے دوبارہ اس کو کاٹ کر ویسا ہی لکھا جیسا کہ آپ بولے تھے''۔

۱۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء دعا گو وحیدالدین

ایک خط

برادر محترم عبد السلام اکبانی صاحب   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۷ مئی ۲۰۰۱ء کو انگریزی میگزین دی ویک (The Week) کے کرسپانڈنٹ مسٹر کارٹیکیا شرما (Kartikeya Sharma) نے انٹرویو لیا۔ گفتگو کے دوران انہوں نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ہندستان کے ہندو اور مسلمان دونوں میں سے اکثر لوگ فنڈامنٹلسٹ ہو گئے ہیں۔ یہ بات اردو اور ہندی اخباروں تک محدود نہیں، انگریزی اخباروں سے جڑے ہوئے لوگ بھی زیادہ تر فنڈامنٹلسٹ ہیں، اگرچہ ان کا فنڈامنٹلزم کسی قدر چھپا ہوا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کی بات درست ہے مگر جس چیز کو آپ فنڈامنٹلزم کہہ رہے ہیں وہ دراصل نفسیاتِ خوف (fear psychosis) کی پیداوار ہے۔ اس ملک میں ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اپنے لیڈروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں دونوں ہی فرقے یکساں طور پر خوف کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ ہندو کا خوف یہ ہے کہ مسلمان اپنی مقدس کتاب قرآن کے حکم کی بنا پر چار چار شادیاں کرتے ہیں اور چوگنا بچے پیدا کرتے ہیں۔ ہندستان میں ان کو اپنے پرسنل لاء کی بنا پر اس کی آزادی ہے۔ اب اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو جلد ہی وہ وقت آئے گا جب کہ مسلمان اس ملک میں تعداد کے اعتبار سے زیادہ ہو جائیں گے اور ہندو خود اپنے ہی ملک میں اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔

مسٹر شرما نے بطور حقیقت میری بات سے اتفاق کیا۔ پھر انہوں نے خود ہی کہا کہ یہ ہندوؤں کا ایک فرضی وہم ہے۔ اس قسم کا معاملہ یہاں ہونے والا ہی نہیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ ہندستان کے سماج میں ایک سے زیادہ شادی کو برداشت نہیں کیا جاتا۔ کوئی آدمی اگر ایک سے زیادہ شادی کر لے تو اس کی زندگی سخت مصیبت بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں کون مسلمان چار شادیوں کا بکھیڑا مول لے

گا۔ انہوں نے کہا کہ چار شادی کا فارمولا ہندستان جیسے سماج میں قابلِ عمل (feasible) ہی نہیں۔ اس طرح خود مسٹر کارٹیکیا شرما ہی نے چار شادی پر مبنی ہندوؤں کے خوف کو ناقابلِ عمل بتا کر رد کر دیا۔

اب مسلمانوں کے مسئلہ کو لیجئے۔ مسلمانوں میں بظاہر بہت سی تحریکیں چل رہی ہیں مگر میرے نزدیک سب کی سب نفسیاتِ خوف کی پیداوار ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان مختلف ظاہری اسباب کی بنا پر اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ تحریکیں شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی عدم تحفظ کے احساس کا اظہار ہیں۔ اسلام کو پولیٹیکل نظریہ کے طور پر پیش کرنا، جہاد کا نعرہ لگانا، ملت کے تحفظ کے نام پر تحریکیں چلانا، ملک کو دارالحرب قرار دینا، وغیرہ سب اسی نفسیاتِ خوف کا نتیجہ ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ یہ کہہ کر مسلمانوں کو مطمئن کرتے ہیں کہ ''چیزوں سے نہیں ہوتا، خدا سے ہوتا ہے'' وہ بھی اسی نفسیات کے زیر اثر کلام کر رہے ہیں، اگرچہ ان کا کلام اپنی نوعیت کے اعتبار سے مسئلہ کا سلبی حل ہے، نہ کہ ایجابی حل۔

اصل یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندستان میں جو حالات پیدا ہوئے وہ مسلمانوں کے مفروضات کے بالکل خلاف تھے۔ کچھ مسلمانوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ آزاد ہندستان ہندو مسلم اتحاد کا ہندستان ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ کچھ مسلمانوں کا یقین تھا کہ سیکولر دستور مسلمانوں کے حقوق کا محافظ بنے گا۔ مگر وہ خیال خام ثابت ہوا۔ کچھ اور مسلمانوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ ہندستان کی سرحد پر پاکستان کی صورت میں ایک مسلم اسٹیٹ کا وجود میں آنا مسلمانوں کے تحفظ کی ضمانت ہوگا، مگر ایسا بھی نہیں ہوا۔ کچھ اور لوگ اس تخیل میں مبتلا تھے کہ پولیٹکل جہاد کے ذریعہ وہ ہندستان کے امام بن جائیں گے، مگر یہ نظریاتی خواب بھی پورا نہیں ہوا۔ اسی طرح کچھ لوگ اسباب کی نفی کر کے شتر مرغ کے نسخہ کے مطابق، اپنی ایک محفوظ دنیا بنانا چاہتے تھے، مگر وہ بھی صرف سراب ثابت ہوا۔

مسلمانوں نے دیکھا کہ ان کے تمام خوشنما مفروضات کے باوجود ملک میں تباہ کن قسم کے فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں۔ تاریخی بابری مسجد ڈھادی گئی اور ان کے پر جوش لیڈر اس کو بچانے کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ سروسوں میں امتیاز، قانون کے نفاذ میں تعصب، ملک کے سیاسی اور اقتصادی نقشے

میں مسلمانوں کا بے جگہ ہوجانا، مسلمانوں کی مدد کے معاملہ میں پاکستان کی مکمل بے بسی، وغیرہ ایسے واقعات تھے جنہوں نے مسلمانوں کے عوام وخواص کو خوف اور مایوسی کی نفسیات میں مبتلا کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی مختلف تحریکیں اسی نفسیات کے مختلف مظاہر ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو مسئلہ پیش آیا اس کے حل کا صحیح آغاز یہ تھا کہ ایک ایسا حقیقی فارمولا دریافت کیا جائے جو ان مسائل کی صحیح توجیہہ کرے اور ان کا قابل عمل حل پیش کرتا ہو۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما تقریباً سب کے سب ردعمل کی نفسیات میں مبتلا تھے، اس لیے وہ نہ ان واقعات کی حقیقی توجیہہ کر سکے اور نہ وہ ان کے حل کا کوئی قابلِ عمل فارمولا پیش کر سکے۔

میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں پیش آنے والے بظاہر ناموافق مسائل کو چیلنج کے روپ میں دیکھا جائے اور مسابقت (competition) کے قانون کی روشنی میں ان کی توجیہہ کی جائے۔ مسلمان اپنے موجودہ ذہن کی بنا پر ان کو اغیار کی سازش اور ظلم کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ اور جب آپ ان کو دوسروں کے ظلم اور سازش کا نتیجہ سمجھیں تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ آپ اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف نفرت میں مبتلا ہو جائیں گے اور منفی نفسیات کے تحت ان کے خلاف کارروائی شروع کر دیں گے۔ اس کے برعکس جب ان مسائل کو چیلنج کا درجہ دیا جائے تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ آپ ان مسائل کو فطرت کے قانون کا نتیجہ سمجھیں گے اور پھر مثبت منصوبہ بندی کر کے تعمیری انداز میں ان کا حل تلاش کریں گے ـــــــ ایک نظریہ خوف کی نفسیات پیدا کرتا ہے اور دوسرا نظریہ مقابلہ کی نفسیات ابھارتا ہے۔

۱۸ مئی ۲۰۰۱ | دعا گو

وحیدالدین

ایک خط

برادر محترم جناب عبدالسلام اکبانی صاحب   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ناگپور میں آپ لوگوں کے ساتھ میں تین دن تک رہا یعنی ۲۹ جون سے یکم جولائی ۲۰۰۱ تک۔ یہ میری زندگی کے یادگار لمحات تھے۔ اس قیام کے دوران بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

عزیزم محمد زبیر اکبانی بیک وقت صالح اور ذہین نوجوان ہیں۔ انہوں نے ائرپورٹ پر مجھ سے دو سوال کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ وزڈم اور وِژن میں کیا فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص مَین آف وژن (man of vision) کس طرح بنتا ہے۔ حسبِ وعدہ اس خط کے ذریعہ دونوں سوالوں کے بارے میں مختصراً عرض کررہا ہوں۔

پہلے سوال کے بارے میں عرض ہے کہ وزڈم (wisdom) سے مراد عقل ہے اور وژن (vision) سے مراد بصیرت ہے۔ وزڈم والا آدمی حال سے مکمل واقفیت رکھتا ہے اور وژن والا آدمی وہ ہے جس کے اندر مستقبل بینی کی صلاحیت ہو۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے یہاں میں انگریزی کے دو استعمال نقل کروں گا۔ وزڈم کے بارے میں انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ:

(wisdom means) the faculty of making the best use of knowledge, experience, understanding.

وژن کے لفظ کا ایک استعمال ویبسٹرز ڈکشنری میں اس طرح نقل کیا گیا ہے:

vision is the ability to perceive something not actually visible, as through mental acuteness or keen foresight.

اب دیکھئے کہ کوئی شخص صاحب بصیرت (man of vision) کس طرح بنتا ہے۔ اس کا بہترین جواب ہم کو ایک حدیث رسول میں ملتا ہے:

ما زهد عبدٌ فی الدنیا الا أنبت اللّٰہ الحکمة فی قلبه و أنطق بها لسانه و

بصره عيب الدنيا و دائها و دواء ها و اخرجه منها سالماً إلى دار السلام (مشکاۃ المصابیح ۳/ ۱۴۳۵)۔

یعنی جب بھی کوئی بندہ دنیا کے معاملہ میں زھد کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کے دل میں حکمت اگا دیتا ہے اور اس کی زبان پر حکمت کا کلام جاری کر دیتا ہے اور اس کو دنیا کا عیب اور اس کا مرض اور علاج دکھا دیتا ہے اور اس کو دنیا سے محفوظ طور پر نکال کر سلامتی کے گھر تک پہنچا دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صاحب بصیرت ہونے کا راز زھد ہے۔ زھد کے معنی عربی زبان میں بے رغبتی (indifference) ہے۔ یہ لفظ رغبت کی ضد کا مفہوم دیتا ہے۔ مثلاً (الزاھد) الراغب عن الدنیا حباً للآخرۃ یعنی زاھد وہ ہے جو آخرت کی محبت میں دنیا سے بے رغبت ہو جائے۔

دنیا سے بے رغبتی سادہ طور پر رہبانیت کا نام نہیں۔ یہ دراصل اپنی سوچ کو مادی یا ظاہری چیزوں سے ہٹا کر زیادہ گہری حقیقتوں کی طرف لے جانا ہے۔ یہ اپنی سوچ میں ترکیز (concentration) لانے کی تربیت ہے اور یہی وہ چیز ہے جو کسی آدمی کو صاحبِ بصیرت بناتی ہے۔

صاحبِ بصیرت انسان وہ ہے جو چیزوں کو کسی آمیزش کے بغیر ویسا ہی دیکھ سکے جیسا کہ وہ ہیں، جس کے اندر بے آمیز طور پر سوچنے (as it is thinking) کی صلاحیت ہو، جو ظواہر سے گزر کر چیزوں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھ سکے۔ کوئی آدمی صاحبِ بصیرت اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو مادی دلچسپیوں سے اوپر اٹھا چکا ہو۔ جب کہ اس کے اندر یکسوئی کے ساتھ غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو۔ جب وہ اپنے آپ کو اس قابل بنا لے کہ حسد اور بغض اور تعصب اور نفرت جیسے جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ جب اس کا حال یہ ہو جائے کہ وہ منفی صورت حال میں بھی اپنے اندر مثبت ذہن کو برقرار رکھے۔

صاحبِ بصیرت انسان بننے کے لئے مذکورہ صفتوں کے علاوہ ایک اور ضروری صفت وہ ہے جس کو تواضع (modesty) کہا جاتا ہے۔ فطری طور پر ہر انسان کے اندر گھمنڈ (arrogance) کا جذبہ ہوتا ہے۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر خود پسند اور انا پسند (egoist) ہوتا ہے۔

یہ جذبہ آدمی سے اعتراف کا مادہ چھین لیتا ہے۔ ایسا آدمی خود اپنے ذہنی خول میں جینے لگتا ہے۔ وہ اعتراف کی صفت سے محروم ہوکر اس قابل نہیں رہتا کہ وہ اپنے سے باہر کسی حقیقت کو پہچان سکے۔ ایسا آدمی اپنی سوچ کے اعتبار سے محدود بن جاتا ہے۔ اور محدود انسان کبھی صاحبِ بصیرت انسان نہیں بن سکتا۔

صاحبِ بصیرت انسان دوسرے لفظوں میں صاحب معرفت انسان ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ اگر ظاہر بیں ہوتے ہیں تو وہ حقیقت بیں ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ اگر اپنے آپ میں سوچنے والے ہوتے ہیں تو اس کی سوچ اپنے آپ سے باہر نکل کر خارجی حقائق کا احاطہ کئے ہوئے ہوتی ہے۔

صاحب بصیرت انسان بننا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ صفت ہمیشہ قربانی کی قیمت پر کسی انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ جسم کی قربانی نہیں بلکہ فکر کی قربانی۔ اور فکری قربانی کی اس فہرست میں سب سے بڑی قربانی انا (ego) کی قربانی ہے۔ صاحب بصیرت انسان بننے کے لئے علم کی حیثیت اگر فکری بنیاد (intellectual base) کی ہے تو اس معاملہ میں قربانی کی حیثیت فکری تطہیر (intellectual purification) کی۔ ان دوطرفہ شرطوں کو پورا کئے بغیر کوئی شخص صاحب بصیرت انسان نہیں بن سکتا۔

وزڈم اور وژن کا فرق ایک تاریخی مثال سے مزید واضح ہوتا ہے۔ یہ حدیبیہ کے واقعہ کی مثال ہے جو پیغمبر اسلام کے زمانہ میں پیش آیا۔ حدیبیہ کے موقع پر فریق ثانی جنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اعراض کا طریقہ اختیار کر کے جنگ سے بچنا وزڈم تھا۔ کیوں کہ جنگی تیاری نہ ہونے کی بنا پر اس وقت اہل اسلام کو یک طرفہ طور پر نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے بعد فریق ثانی کی شرطوں کو مان کر دس سال کے لئے امن کا معاہدہ کرنا وژن کی مثال ہے۔ کیوں کہ اس معاہدۂ امن کے اندر مستقبل کے اعتبار سے ''فتح مبین'' کا راز چھپا ہوا تھا۔

نئی دہلی، ۳ جولائی ۲۰۰۱ دعاگو وحید الدین

ایک خط

برادر محترم عبدالسلام اکبانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۵ مئی ۲۰۰۱ کو ٹیلی فون پر گفتگو کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آپ سے گفتگو کے بعد یہ سوال میرے ذہن میں آیا کہ قرآن فہمی کے لئے جو شرطیں ہماری کتابوں میں بتائی جاتی ہیں، وہ موجودہ زمانہ کے بڑے بڑے علماء کو بدرجۂ کمال حاصل تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود وہ موجودہ زمانہ کی نسبت سے قرآن کی رہنمائی حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے، جیسا کہ خود ان کی بعد کی روش سے ثابت ہوتا ہے۔ جدید مسائل کے معاملہ میں ہمارے علماء نے ابتداءً جو موقف اختیار کیا، بعد کو انہیں اس سے بلا اعلان رجوع کرنا پڑا۔

ہمارے اکابر علماء نے انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں مغربی سامراج کے خلاف مسلح جہاد کا فتویٰ دیا۔ پھر نصف صدی سے زیادہ مدت کی تباہ کن جدوجہد کے بعد مجبور ہو کر انہیں پرامن جدوجہد کی طرف لوٹنا پڑا۔ سیکولر ڈیماکریسی کو پہلے ان علماء نے ناقابل قبول کافرانہ نظام بتایا اور اب اپنے سابقہ اعلان کو واپس لئے بغیر اسی کافرانہ نظام کو قبول کر کے تمام علماء مصالحانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ انیسویں صدی میں ان علماء نے جن ملکوں کو دارالحرب قرار دیا تھا اور ان کے خلاف جہاد کو فرض بتایا تھا، اب یہ ملک ان کی اپنی تعریف کے مطابق، سُپر دارالحرب ہو چکے ہیں۔ مگر اب وہ اور ان کی اولاد و احفاد اپنے سابق فتویٰ کو واپس لئے بغیر انہی ملکوں میں اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان علماء نے پہلے مغربی تہذیب کو اسلام دشمن بتا کر اس کو سب سے بڑی برائی قرار دیا۔ اب اپنے سابق اعلان کو واپس لئے بغیر ان کا پورا گروہ اسی مغربی تہذیب سے مصالحت کر کے اس کے اندر اپنے مستقبل کی تعمیر کر رہا ہے۔ اسی طرح ان علماء نے جدید غیر اسلامی نظام کو دارالطاغوت قرار دیا، اور اس سے سمجھوتہ کر کے زندگی گزارنے کو حرام بتایا۔ اب وہ اپنے سابق اعلان کو غلط قرار دئے بغیر اس سے مفاہمت کر کے ''دیندارانہ'' زندگی گزار رہے ہیں۔

اسی طرح ہندستان میں بابری مسجد یا فرقہ وارانہ فساد جیسے معاملات میں تمام علماء براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ٹکراؤ کے طریقہ کو مسئلہ کا حل بتاتے رہے۔ حتی کہ وہ ''ضرر رسانی'' کے فلسفہ کی حمایت کرتے ہوئے پر جوش طور پر اس قسم کے اشعار پڑھتے تھے:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹوں میں ہو خوئے حریری

مگر اب یہ تمام علماء عملاً محاربت کے اس نظریہ کو ترک کرکے پر امن انداز میں کلام کر رہے ہیں، وغیرہ۔

جیسا کہ معلوم ہے، اس طرح کے معاملات میں یہ علماء پہلے جہاد و قتال کی اصطلاحوں میں بولتے تھے۔ مگر اس کے بعد تمام علماء کا حال یہ ہوا کہ تلخ نتائج کی مجبورانہ منطق تو ان کو سبق سکھانے میں کامیاب ہوگئی، مگر قرآن کی تعلیمات سے اصولی رہنمائی حاصل کرنے میں وہ سراسر ناکام رہے۔

اس واقعہ پر غور کیجئے تو ان علماء کے بارہ میں دو میں سے کوئی ایک رائے قائم کرنی پڑے گی۔ یا تو یہ کہا جائے کہ یہ لوگ دو عملی کا شکار ہیں یا یہ مانا جائے کہ موجودہ زمانہ کی نسبت سے وہ قرآن کی رہنمائی حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ میں ذاتی طور پر اس کو اھون سمجھتا ہوں کہ علماء کے اس معاملہ کو دوسرے خانہ میں رکھا جائے۔

مزید غور کرنے پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن فہمی کی فنی شرطوں کے علاوہ ایک اور شرط ضروری ہے، اور ہمارے علماء فنی شرطوں کے ماہر ہونے کے باوجود اس مزید شرط پر پورے نہیں اترے۔ اس لئے وہ موجودہ حالت میں قرآن کی رہنمائی حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

میرے نزدیک یہ مزید شرط ہے——— چیزوں کو جیسا ہے ویسا (as it is) دیکھنا، محبت اور نفرت سے بلند ہو کر رائے قائم کرنا۔ چنانچہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کے اندر نفرت کی نفسیات ہو تو وہ منصفانہ طرز فکر سے محروم ہو جائے گا (المائدہ ۸)۔ ان علماء کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ حضرات اس مزید شرط پر پورے نہیں اترے۔ مثال کے طور پر اس دور کے تقریباً تمام علماء کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغرب کی استعماری قوموں سے شدید نفرت میں مبتلا تھے۔ حتی کہ ہر عالم کے حالات زندگی میں تعریف کے طور پر یہ لکھا جاتا ہے کہ

’’حضرت کو ان قوموں سے شدید نفرت تھی۔‘‘

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کسی کے خلاف آپ نفرت میں مبتلا ہو جائیں تو اس کے بارے میں آپ درست رائے قائم نہیں کر سکتے۔ بظاہر آپ قرآن کے عالم ہوں گے مگر نفرت کا جذبہ آپ کو اس طرح متاثر کر دے گا کہ قرآن و حدیث کی کھلی تعلیمات کے باوجود آپ اس کے بارہ میں درست رائے قائم کرنے میں ناکام رہیں گے۔ فنی علوم کی مہارت کے باوجود آپ کی رائے متعصّبانہ رائے بن کر رہ جائے گی۔

درست رائے قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ چیزوں کو ویسا ہی دیکھیں جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اگر آپ کی آنکھ پر نفرت کی عینک لگی ہوئی ہو تو فنی علوم میں مہارت کے باوجود آپ یقینی طور پر صحیح رائے قائم کرنے میں ناکام رہیں گے۔

جن علوم و فنون کو قرآن فہمی کے لئے لازمی شرط بتایا جاتا ہے وہ بجائے خود درست ہیں۔ مگر قرآن فہمی کے لئے یہی کافی نہیں۔ انسان کوئی مشینی کمپیوٹر نہیں۔ انسان اکثر مختلف قسم کے منفی جذبات (negative sentiments) کا شکار ہو جاتا ہے۔ منفی جذبات اس کے ذہن پر غلبہ حاصل کر کے اس کو ایک قسم کی متاثر سوچ (conditioned thinking) میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ متاثر سوچ اکثر حالات میں درست رائے قائم کرنے میں فیصلہ کن رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اس لئے صرف فنی علوم میں مہارت اس بات کے لئے کافی نہیں کہ آدمی قرآن کی صحیح تفسیر کرنے میں کامیاب رہے۔ ضروری ہے کہ وہ اسی کے ساتھ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو۔ وہ حدیث کے الفاظ میں یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھ سکے جیسا کہ وہ ہیں (**اللّٰھم ارنا الاشیاء کما ھی**)۔

۸ مئی ۲۰۰۱ دعا گو وحید الدین